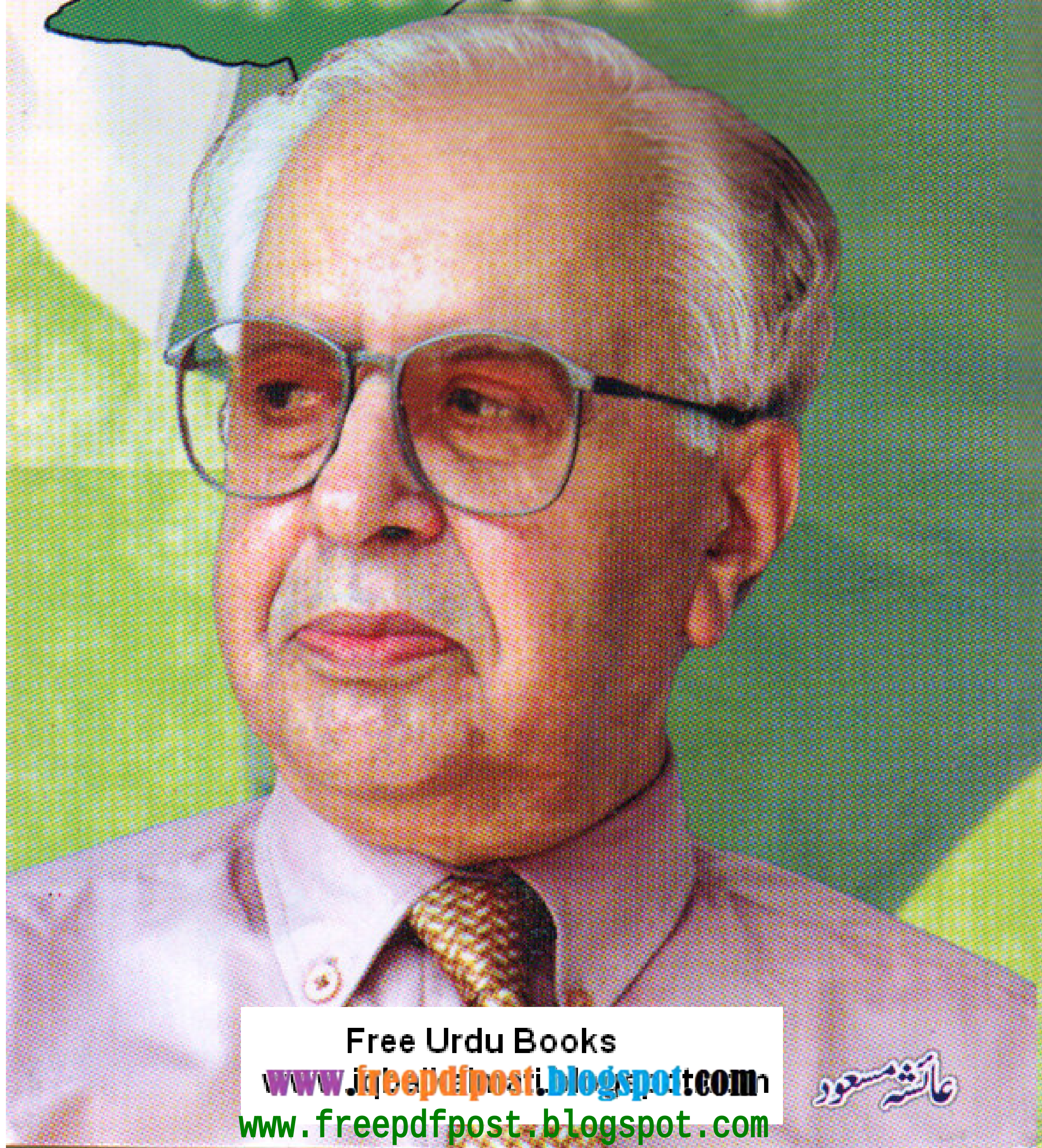
اسلام، نظریہ پاکستان اور جمہوریت کیلئے کوشاں رہوں گا

جب تک میں زندہ ہوں

مجید نظامی کی کہانی ان کی زبانی!



عائشہ مسعود

جب تک میں زندہ ہوں

اسلام، نظریہ پاکستان اور جمہوریت کے لیے کوشاں رہوں گا

مجید نظامی

عائشہ مسعود


www.freepdfpost.blogspot.com

انتساب

والدِ محترم کے پوتوں کے نام
جو بارِ مرگ نہ اٹھا سکے

''میری آنکھیں جنہیں بوسہ دیا کرتی تھیں''

عائشہ مسعود

حسن ترتیب

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو

جب تک میں زندہ ہوں

اسلام، نظریہ پاکستان اور جمہوریت کے لیے کوشاں رہوں گا

مجید نظامی

عائشہ مسعود

پیش لفظ

رفاقتوں کے پھول حیات تازہ سے ہمکنار رہیں گے

اسلوب نگارش دلفریب ہو سکتا ہے اور انداز تحریر دلکش ...... مگر سچائی کے شفاف آئینہ مثال لفظوں سے صداقت کی رعنائی منعکس ہو رہی ہو...... تو ایسے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو ہمکلام ہو کر روشنی کے اس راستے پر ڈال دیتے ہیں جس راستے پر جادہ حیات منور ہو جائے ...... ورنہ اپنے آپ کو ''کامل'' سمجھنے والے ادھورے لوگوں سے ملتے زندگی اکتا جاتی ہے اور روح مضمحل ہونے لگتی ہے...... اور ایسے لوگوں سے جو عز و شرف کی دنیا میں پست اور پستی میں کھڑے بلند و بالا دکھائی دیتے ہیں۔ دل ایسے جہاں سے ہمیشہ دور ہی رہا کہ جس کا کوئی موسم نہیں ہوتا...... باد صبا، بارش اور خوشبو...... کچھ بھی نہیں ...... جس کی مٹی گلاب، یاسمین اور چنبیلی سے معطر نہیں ہوتی ...... وہاں سورج دھوپ پھیلانے بھی نہیں آتا...... مگر خال خال ...... ایسا ہوتا ہے...... کہ جن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں یہ احساس ہو کہ میں اجنبی نہیں ہوں ......

اور اس شہر کی کنجیاں میرے پاس ہیں اور میں دل دروازے سے یقین اور اعتماد کے ساتھ داخل ہو کر صحراؤں، پہاڑوں اور دریاؤں کو دیکھ سکتی ہوں......

مجید نظامی سے پہلی ملاقات میں ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کم گوئی نے ہی گیان دھیان کی شمعیں روشن کی ہوئی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں شفقت اور کرب کی کتاب تھی اور میں نے وہ کتاب ورق ورق پڑھنے کا ارادہ کر لیا تھا تا کہ لوگ ہجوم در ہجوم جان سکیں کہ سروں پہ کانٹوں کا تاج سجا کر اصولوں کے تخت پر بیٹھنے والے لوگ کون ہوتے ہیں...... لہٰذا ملاقاتیں ہوتی رہیں...... مجید نظامی لاہور میں تھے اور میں اسلام آباد میں...... نظامی صاحب نے کہا شہروں کا یہ فاصلہ کیسے ممکن بنائے گا کہ آپ یہ کام مکمل کر سکیں...... تو میں نے کہا...... اگر مجھے ہر روز اسلام آباد سے آنا پڑے اور پھر واپس جانا پڑے تو میں یہ بھی کر گزروں گی...... تو مجید نظامی نے کہا...... میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ اللہ آپ کے حال پر رحم فرمائے...... اور اللہ نے کرم کیا کہ میں عظمت مآب قومی فریضے کو ادا کر سکوں۔

اسی طرح ایک مرتبہ میں نے ٹیلی فون پر لاہور ان سے ملاقات کا وقت طے کرنا تھا۔ مجید نظامی نے کہا...... پرسوں بارہ بجے آ جایئے گا...... میں پونے بارہ بجے نوائے وقت لاہور کے آفس میں موجود تھی...... میں نے چٹ لکھ کر نظامی صاحب کو بھجوائی...... آپ نے فرمایا تھا کہ بارہ بجے آیئے گا...... نظامی صاحب! ''بارہ بج چکے ہیں'' ...... لہٰذا دوسری مرتبہ ٹیلی فون پر ملاقات کے لئے بات ہوئی تو کہنے لگے...... پرسوں بارہ بجے نہیں ایک سے ڈیڑھ بجے آیئے گا...... مجید نظامی وضاحت کے ابہام میں نہیں پڑتے بلکہ لطیف کنائے میں احساس کو چھونے والا اختصار اختیار کرتے ہیں

لفظوں کے برہنہ وسیلے سے بات سمجھنے والے لوگ گہرائیوں کے عکس کی پیمائش نہیں کر سکتے ...... لیکن تیز روشنی اور مدہم روشنی کے فرق اور کشش کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

غیرت قومی کو زندہ رکھنے والے افراد وطن کی محبت میں محبّ بھی ہوتے ہیں اور محبوب بھی ...... جو مقصد کی عظمت کو ابدیت تک قائم رکھتے ہیں اور فنا نہ ہونے والی حقیقتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ مملکت کے بغیر بادشاہ ہونا بھی کم لوگوں کو ہی نصیب ہوتا ہے ورنہ یوں بھی ہوتا ہے کہ عقاب چوہوں کے ساتھ رہنا شروع کر دیتے ہیں ...... مجید نظامی نے سب کے ساتھ شفقت روا رکھی ...... ناتواں، طاقت ور، منافق یا سچا جھوٹا ...... لیکن محبت اور دوستی کا ستارہ خاص تھا، جس کی جگمگاتی ہوئی کرنوں کو سہارنا آسان نہیں تھا سو انہوں نے شاید ہی کسی کو آزمایا ہو ...... ان کے ساتھ مہر، الفت اور وفا کا تعلق اوج کمال کا احاطہ کیے ہوئے ہو سکتا ہے۔

جستجو کے اس سفر میں ساحل مراد تک پہنچتے پہنچتے مجید نظامی کے آس پاس مجھے صرف آفتاب فرخ ہی دکھائی دیے ...... جو دیار ماضی میں جھانکتے ہوئے خوابیدہ تمناؤں پر مناظرے کرتے رہتے ہیں اور ماضی کی سٹیج پر سے گزرنے والی تصاویر کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ایک دن لنچ پر جب میں بھی شریک طعام تھی یوں ہی باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھوں میں بھی کئی چراغ ٹمٹمانے لگے جیسے ساز کے تاروں نے کوئی نغمہ متلاطم کر دیا ہو اور بہت ساری باتیں ہوئیں لیکن مجھے کوئی تکان یا پژمردگی کا احساس نہیں ہوا کیونکہ یہ سفر گہرائیوں اور پستیوں کا سفر نہیں تھا۔

مجید نظامی کے ساتھ مختلف ادوار میں ہونے والی ملاقاتوں میں وطن کی گرد

آلودہواؤں سے لیکر پیرس، لندن اور مشرق ومغرب تک کا سفر طے کیا۔ طوق سلاسل میں جکڑی ہوئی انسانیت دیکھی، ناانصافی کے ریگزاروں پر سلگتی ہوئی سوچوں کی تپش محسوس کی، محلوں کی طرف آنے والے جانے راستے اور استعماری قوتوں کی ہوس کاریوں کے ساتھ امید وناامیدی کی پرچھائیوں کا سفر طے کیا۔ مجید نظامی نے ماضی کی تصاویر دکھائیں تو یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنے اصلی رنگ اور خدوخال کے ساتھ منعکس ہوگئیں اور ان لمحات کے سارے اسرار منکشف ہو گئے ہیں...... اور کہیں گفتگو کے دوران وقفہ آیا تو سکوت وخاموشی ہمکلام ہوتی رہی۔

مجید نظامی کے ساتھ رفاقتوں کے پھول حیات تازہ سے ہمکنار رہیں گے، میری سوچوں کی نقرئی تتلیاں ان وادیوں میں اڑتی رہیں گی جہاں کی ہر صبح نوفردا کی رعنائیوں کو گردآلود ہوتا نہیں دیکھ سکتی...... میری بصارتوں کے ستارے آسمانی پہنائیوں میں لرزاں عہد خوش آئند پر مشتمل خواب جمیل سے آراستہ وپیراستہ رہیں گے جو سال خوردہ زندگی کی تاریکیوں میں بھی جگمگائیں گے...... مگر یہ کتاب پڑھ کر کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ہمارے خواب ہمیں بلا رہے ہیں...... کہیں ایسا تو نہیں ہم کسی ایسی جگہ کی طرف چل پڑے ہیں جسے ہم نہیں جانتے۔ آپ کی بصیرت اور بصارت کیا کہتی ہے؟

عائشہ مسعود

شاخِ گُل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

پہلا باب

''توں آپی ہوویں گا''

مجید نظامی اڑھائی برس کے تھے جب سانگلہ ہل میں ایک ایسی شام اتری کہ جب قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا۔ زمانہ بچپن کی شگفتگی محو گریہ ہو گئی۔ معصوم دل تو فرط الم سے شق ہونا بھی نہیں جانتا تھا لہٰذا ہوا کے گرم و سرد جھونکوں میں چراغ جلتا رہا اور سنت نبوی علیہ وسلم پر عمل پیرا کم سنی یتیمی میں سفر آغاز کر بیٹھی مگر شگفتگی کی جگہ افسردگیوں کا حصار قائم رہا۔ باپ کا تصوراتی ہیولہ ہلکی پھلکی ''باد نسیم'' کی طرح شاخ حیات پر کھلے ہوئے ہر پھول میں تروتازہ رہا۔ کیونکہ کسی کے خوشنما ہاتھوں کا احساس تھا جو مجید نظامی کے بے مزا اور تلخ ذائقوں میں مٹھاس گھولتا رہا۔

بیتے ہوئے دنوں کے قدموں کی آہٹ مجید نظامی کو چشم زدن میں سبک رفتار پرندے کی طرح اس منظر تک لے جاتی ہے۔ جہاں شفقت پدری میں دھڑکتے دل کے ساتھ مضطرب

انگلیاں انہیں نیند سے پہلے ''برفی'' کھلایا کرتی تھیں۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی شورشیں سہانے خواب محو کر دیا کرتی ہیں مگر مقدس روحوں کا خیال زندگی کی شوریدہ سری میں بھی خستہ پا نہیں ہوتا۔ چودھویں کا چاند اپنی جملہ تابانیوں کے ساتھ طلوع ہو کر رہتا ہے۔ لہٰذا مجید نظامی کے اہتمام طعام ودہن کے جملہ لوازمات میں ''برفی'' کے ٹکڑے ہمیشہ موجود رہے جو روز و شب کے تلخ موسموں کے شدتوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے احساس میں ''شہر پناہ'' بن جایا کرتے تھے۔

مجید نظامی کے والد مرحوم صابن بنانے کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ ان کی قید حیات اس طرح پوری ہوئی کہ صابن بھی خود بناتے اور ''مارکیٹنگ'' بھی خود کیا کرتے تھے۔ بڑے لوگوں کو ''کام'' اور ''بیداری'' میں سکون حاصل ہوتا ہے۔ مجید نظامی کا بھی آج یہی شیوہ حیات ہے۔ والد کے ساتھ مختصر مگر معصوم رفاقت و محبت کو وطن کی مٹھاس ''برفی'' کی طرح اور آلائشوں سے پاک معاشرے کی ضرورت صابن کی ''تندی'' کی طرح محسوس ہوتی رہی۔

مجید نظامی کا آبائی گھر سانگلہ ہل شیخوپورہ میں ہندوؤں کے محلے میں تھا۔ سامنے کے اور دائیں بائیں کے پڑوسی ہندو تھے۔ لہٰذا ہڈی والا گوشت گھر میں نہیں آتا تھا تاکہ ''ہڈیاں'' باہر نہ پھینکی جائیں۔ ہڈی والا گوشت نہ لانے کی وجہ ہندوؤں کے مذہب اور رسم و رواج کا احترام ملحوظ خاطر رکھنا تھا کیونکہ ہندو گائے کو ''گاؤ ماتا'' جبکہ مسلمان ''ماں'' کی ممتا کو ماننے والوں میں سے تھے۔ لیکن مجید نظامی کی والدہ ہندو ہمسایوں کے احترام کا خیال رکھتی تھیں۔ آج بھی مجید نظامی اپنے گھر میں ہڈی والا گوشت لانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ماں باپ تو دراصل پرندوں کی طرح ہوتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ مگر بچوں کے دل کے دروازے کھول کر انہیں سچائی کے راستوں سے آشنا کر جاتے ہیں۔ دو آنکھیں دیئے کے طرح بجھ کر بھی روح کی عمیق گہرائیوں کو چیر کر گزرتی ہی رہتی ہیں۔ اور راستہ دکھاتی ہیں۔

مجید نظامی والدین کے ساتھ ہندوؤں کے محلے میں رہائش پذیر تھے۔ یہاں کار حیات اور کاروبار ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ یہاں صابن بنتا تھا لہٰذا بڑے بڑے ''کڑاہے'' اور کیمیکلز بھی ہوا

کرتے تھے جنھیں مشین کے ٹھپے میں ڈال کر "صابن" بنایا جاتا تھا۔ صابن کی دکان گھر کی پشت پر تھی۔ والد کی وفات کے بعد ان کی والدہ کو گھر، دکان اور کاروبار سمیت سب چیزوں کو خیر باد کہنا پڑا، کیونکہ بیٹے ابھی اس قابل نہیں تھے کہ یہ کاروبار چلا سکتے۔

مجید نظامی "شب" کے اسرار سے پھوٹنے والی "صبح" کے اولین طلسماتی تعلق میں ماں کے ہاتھ کے "پراٹھے" بھی یاد کرتے ہیں۔ اولاد اور والدین کے مابین یہی تعلق محبت کی لہلاتی فصلیں اگایا کرتا ہے۔ ماں کے ہاتھ سے بنے "گڑ" کے چاول بھی رفاقت کی انہی فصلوں میں آج بھی لہلہاتے ہیں۔ انہیں ماں کی نمازیں اور ہر وقت مصلے پر تشریف فرما ہونا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہنا یاد آتا ہے۔ اس وجہ سے بچپن میں شرارتی بچہ ہونے کے باوجود مجید نظامی کئی نمازیں باجماعت پڑھتے تھے اور ہائی سکول کے زمانے میں نماز جمعہ تو باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔

ماں کی محبت باران رحمت کی طرح ہوتی ہے۔ جو بچوں کو روحانی سرشاری عطا کرتی ہے۔ یہی "سرشاری" زندگی کے نشیب وفراز میں برکتوں کا سندیسہ لے کر اترتی ہے اور زندگی کے اوراق پریشاں سلیقے سے سنورتے نکھرتے رہتے ہیں۔ روح کا کھوکھلا پن انسان کو بیمار کرتا ہے۔ روحانی تسکین کے سامان کے لیے مجید نظامی کی والدہ اپنے بچوں کو خود قرآن پڑھایا کرتی تھیں۔ بہن بھائیوں کیلئے والدہ کی گود پہلی درسگاہ تھی جسمیں پڑھایا جانے والا سبق بچے "پہلی" محبت کی طرح عمر بھر فراموش نہ کر سکے۔ مجید نظامی بھی عمر بھر کم وبیش صوم وصلوٰۃ کے پابند رہے۔

والدہ سے قرآن کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مجید نظامی میونسپل بورڈ کے پرائمری سکول سانگلہ ہل میں داخل کرا دیے گئے۔ یہ وہ مرحلہ تھا جو مستقبل کی روشنی سے ہم آہنگ ہو رہا تھا۔ داستان حیات کا وہ پہلا باب کہ جسے کتاب زندگی میں شفق صبح کے رنگ سے ملتے جلتے الفاظ تحریر کرنے تھے۔ پیاسی زمین پر بادلوں کی تراوٹ برسنی تھی اور جس میں رضا ورغبت کے ساتھ علم وفن کے موتی چننے کی آرزو پوری ہونا تھی۔

شہر نما قصبے سے سکول کے دروازے تک لمبی پکی گلی جاتی تھی۔ سکول کے اندر پگڈنڈیوں کے اطراف میں اتنے پھول کھلتے تھے کہ کسی باغیچے میں سے گزرنے کا گماں ہونے لگتا تھا۔ یہ پرائمری سکول کمپنی باغ کے پہلو میں واقع تھا۔ طالب علم "ٹاٹ" پر بیٹھ کر پڑھا کرتے مگر بجائے تھکاوٹ محسوس کرنے کے شگفتگی کا احساس نمایاں رہتا۔ بھگت سنگھ مونا سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ پہلی جماعت کو مولوی برکت علی پڑھایا کرتے تھے۔ مولوی برکت علی نے کسی وجہ سے مجید نظامی کو ماں کی گالی دی تو مجید نظامی نے دوٹوک کہا۔ "توں آپی ہوویں گا" اس جملے کے ادا ہوتے ہی استادِ محترم نے مجید نظامی کو پٹائی کے بعد جماعت سے باہر نکال دیا۔ لہٰذا ہیڈ ماسٹر بھگت سنگھ مونا کو انہیں اپنے ساتھ بٹھانا پڑا۔ بھگت سنگھ مونا چوتھی جماعت کو پڑھایا کرتے تھے لہٰذا مجید نظامی نے بھی "پہلی" جماعت "چوتھی" جماعت کے ساتھ بیٹھ کر پڑھی مگر مجید نظامی جب تیسری جماعت میں پہنچے تو جماعت کے انچارج دوبارہ مولوی برکت علی ہی تھے مگر اب مولوی صاحب سے تعلق داری کچھ اس طرح استوار ہوئی کہ پورا رمضان استادِ گرامی کیلئے مجید نظامی "لسی" اکٹھی کرتے رہے۔

سہولیات کے اعتبار سے یہ بہترین درسگاہ تھی۔ مجید نظامی نے پرائمری مدارج طے کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول سانگلہ ہل میں درجہ نہم تک تعلیم مکمل کی۔ اس سکول کی عمارت کشادہ تھی۔ کھیل کے میدان کے علاوہ جماعت کے لئے کھلے کھلے کمرے تھے اور کلاس روم میں "ڈیسک" ہوا کرتے تھے۔ یہاں سائنس کے مضامین پڑھانے کے ساتھ ساتھ "ڈرائنگ" کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ دیہات سے آنے والے طلباء کے لئے دو ہاسٹل تھے۔

رنگوں کا انبوہ بچوں کے ذہنوں میں حیرت و استعجاب کے در کھول دیتا ہے۔ بچے تمام کلفتیں بھول جاتے ہیں اور معصوم و مسرور بچے ایک عالمِ حیرت میں دم بدم رنگوں کے کھیل ہی کھیل میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مجید نظامی ڈرائنگ کے بہت اچھے طالب علم تھے۔ فنونِ لطیفہ سے محبت کے اسی رجحان نے آگے چل کر مجید نظامی کو "دو اور دو چار" کے چکر میں پڑنے نہیں دیا۔

کیونکہ اپنے آپ سے محو گفت وشنید ہونے کا ہنر کہ جہاں انسان کی روح سمیع وبصیر ہو جاتی ہو وہاں الفاظ کے جوڑ توڑ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ مجید نظامی کو ڈرائنگ ایک ''سکھ'' استاد سکھایا کرتے تھے جو ''سکھ'' ہو کر بھی نماز جمعہ کا خطبہ سننے مسجد جاتے تھے۔ سکول میں پہلے خواجہ احمد دین ہیڈ ماسٹر تھے جو ذرا ''صاحب'' ٹائپ کے تھے۔ ان کے بعد گوجرانوالہ سے نئے ہیڈ ماسٹر آ گئے۔ یہ ہیڈ ماسٹر بڑی بارعب شخصیت تھے۔ اور ''فرنچ کٹ'' داڑھی ان کے مخصوص سٹائل کا حصہ تھی۔ سکول کے ان زمانوں میں مجید نظامی ''پڑھاکو'' نہیں تھے لیکن ذہین تھے لہٰذا پورا سال ''کھیل کود'' میں گزار دیتے اور سال کے آخری ایام میں پڑھائی کر کے اول آتے ''رٹا'' لگا کر پڑھنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ البتہ مانیٹر بننا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مجید نظامی دوست بنانے میں ''سلیکٹو'' تھے۔ خود بھی خوبرو تھے اور دوست بھی خوبرو پسند کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کے دوست شوکت علی خان اور حامد حسین ہوا کرتے تھے۔ شوکت تو کوئٹہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حامد حسین ڈیفنس میں آج بھی اپنے گھر میں تن تنہا اللہ اللہ کرتے ہیں اور بارِیش بنے ہوئے ہیں۔

دوسرا باب

نہرو، اندرا گاندھی اور گھڑ سواری

تقسیم سے پہلے بھی سانگلہ ہل ماڈرن قصبہ تھا۔ یہاں کی آبادی دس بارہ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ جن میں ہندو سکھ اور مسلمان شامل تھے۔ سانگلہ ہل کے ساتھ "ہل" کا لفظ اس لئے آتا ہے کیونکہ وہاں نہر کے پار ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس پر چڑھتے چلے جانا مجید نظامی کو مرغوب تھا۔ اس پہاڑی کے آس پاس چند میل کے فاصلے تک اور بھی پہاڑیاں تھیں۔ اس علاقے میں نہر آنے سے پہلے زمین کم و بیش "صحرائی" تھی۔ نہر کی آمد کے بعد سانگلہ ہل نہ صرف باقاعدہ قصبہ بن گیا بلکہ مجید نظامی بھی "مردِ صحرائی" سے "مردِ کوہستانی" بن گئے۔

جن دنوں لوگ شاخوں کے سائے میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے اور ٹھنڈی چھاؤں سایہ فگن رہتی تھی۔ گلی محلے بھی آباد ہوا کرتے تھے اُن دنوں مجید نظامی "گلی ڈنڈا" کھیلا کرتے تھے

اور قصبے کے قریب بہنے والی نہر میں ''تیراکی'' کی کوشش کیا کرتے کیونکہ اچھے پیراک نہ ہونے کی وجہ سے دور تک تیرتے رہنا تو دشوار تھا البتہ نہانے کا شوق وہ ''ٹھیک ٹھاک'' پورا کر لیا کرتے تھے۔ اسی شوق میں ایک بار ڈوب بھی گئے لیکن کسی نے بچا لیا جسے اللہ رکھے۔۔۔۔

صبح کی لطافتوں کی سرور اور آفتاب کی شعاعوں سے تازگی حاصل کرنے سے موجودہ عہد کے بچے نا آشنا ہیں مگر پتوں کی سرسراہٹ اور ہوا کے جھونکوں کی چھیڑ چھاڑ سے مجید نظامی کے دور کے بچے آشنا تھے۔ مجید نظامی کبھی کبھی نہر کے کنارے صبح کے وقت ورزش کرتے تھے لیکن ''اکھاڑے'' میں روزانہ ورزش کرنا ان کا معمول نہ بن سکا لیکن رغبت انہیں مویشیوں کے اس ماہانہ میلے سے بھی تھی جو پہاڑی کے دامن میں لگا کرتا تھا اور جہاں ''نیزہ بازی'' کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ میلوں ٹھیلوں کا اہتمام دیہی زندگی میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ سینکڑوں لوگ جمع ہوتے ہیں چہروں سے غیر معمول مسرت کا اظہار ہوتا ہے۔ مقابلوں میں حصہ لینے والے نوجوان پوری سج دھج کے ساتھ میلے میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ مقابلہ جیت جانے والے ''فتح مند'' بہادروں کی حیثیت سے لوگوں کے ہجوم پر نظر دوڑاتے ہیں۔ اس وقت تک ہر شخص اپنی جگہ جم کر کھڑا رہتا ہے۔ قصبے میں لڑکے پتنگ بازی کا شوق بھی رکھتے تھے لیکن مجید نظامی کو اس کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے نہیں کہ کوئی ''ڈور'' انہیں کاٹ سکتی تھی بلکہ اس لئے کہ یہ ان کے بس کا روگ ہی نہیں تھا لیکن نوجوانی کے دور میں جب خوابوں کے محلات نے دن رات کو سجا دیا تو رمی فلیش شوق سے کھیلنے لگے۔ ''رمی'' کا کھیل پیسہ لگا کر کھیلا جاتا تھا۔ رمی کے علاوہ ''برج'' کھیلنا بھی انہیں پسند تھا۔

سانگلہ میں دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب شب سیاہ کی آغوش میں سکون پذیر ہوتا تو بچھڑے ہوئے پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنے لگتے آسمان پر ستارے جگمگا اٹھتے تب چودھویں کا چاند روشن ہو جاتا۔ درختوں سے روشنی چھن چھن کر آنے لگتی تو یوں محسوس ہوتا کہ نیند کے خمار میں لپٹی ہوئی کائنات سکون کا سانس لے رہی ہے۔ سانگلہ ہل میں اترنے والی رات اور صبح تو اتنی ہی حسین ہوا کرتی ہیں اس جدید قصبے میں محلوں کی گلیاں کھلی کھلی تھیں اور ایک دوسرے کو ''کراس'' کرتی تھیں۔ گلیوں کے دونوں سروں پر پکی نالیاں تھیں جن کی وجہ سے انعکاس کے

مسائل پیدا نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی گندگی دکھائی دیتی تھی۔ ماشکی مشک میں پانی بھر کر لاتے اور خاکروب نالیاں صاف کرتے میونسپل کمیٹی کا سیکرٹری یہ کام اپنی نگرانی میں کرایا کرتا تھا۔ سانگلہ ہل میں بجلی نہیں تھی مگر گیس کے لیمپ تھے جو گلیوں میں نصب تھے جس سے گلیاں روشن رہتی تھیں۔

گزرے ہوئے وقت کے قدموں کی آہٹ سننے پر مجید نظامی کہتے ہیں کہ انہیں ''کتوں'' اور ''بلیوں'' سے کوئی رغبت نہیں تھی بلکہ ''گھن'' آیا کرتی تھی البتہ ''گھوڑے'' سے واسطہ سیکنڈ ایئر پڑھنے کے دوران پڑا تھا۔ 1946ء میں مجید نظامی چند دن کے لئے دوستوں کے ساتھ براستہ جموں سری نگر گئے اور وہاں سے ''پہلگام'' گئے جہاں رائیڈنگ کے لئے گھوڑے ملا کرتے تھے جس طرح پاکستان میں مری کے پہاڑی علاقوں میں ہوتے ہیں۔ پہلگام میں قیام کے دوران لوگوں کو خیموں میں رہنا پڑتا تھا۔ مجید نظامی نے وہاں پہلی مرتبہ ''نہرو اور اندرا گاندھی'' کو رائیڈنگ کرتے ہوئے دیکھا۔ اسی ٹور میں سری نگر واپسی پر مجید نظامی نے مولانا آزاد کا دریائی جلوس دیکھا۔ مسلمان اُن پر جوتے اتار اتار کر پھینک رہے تھے جبکہ شیخ عبداللہ کے حامی ان کا والہانہ استقبال کر رہے تھے۔

نومبر 1954ء کے سرراہے میں مجید نظامی نے مولانا آزاد کا ہی ایک واقعہ لکھا تھا کہ 1945 میں شملہ کانفرنس کے زمانے میں مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ مولانا نے قائداعظم کو ''تار'' بھیجا کہ آپ مجھ سے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان معاہدے کے لئے گفت وشنید کریں قائداعظم نے اس ''تار'' کا مختصر سا جواب بھیج دیا۔

''مجھے بات چیت کرنا ہوگی ...... تو مسٹر گاندھی سے کروں گا جو کانگریس کے اصل لیڈر ہیں، آپ سے مل کر وقت کیوں ضائع کروں آپ تو محض ایک ''شو بوائے'' ہیں''۔

اس وقت ہندوستان کی کانگریس نے شور و احتجاج سے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا کہ قائداعظم نے کانگریس کے صدر کو ''شو بوائے'' کہہ کر اس کی توہین کی ہے' لیکن بعد میں ایک معزز و موقر جریدے نے لکھا کہ کانگریس کے نئے صدر مسٹر دھیر پنڈت نہرو کے ''شو بوائے'' ہوں گے۔

سری نگر میں گھوڑے کی پشت پر سواری کے علاوہ گھوڑے کے ساتھ بالواسطہ واسطہ مجید

نظامی کو "تانگے" کی شکل میں سانگلہ ہل میں پڑ چکا تھا۔ وہ اس طرح کہ سانگلہ ہل سے "شاہ کوٹ" دس بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ شاہ کوٹ میں ہر سال پیر نولکھ ہزاروی صاحب کے مزار پر ایک میلہ ہوا کرتا تھا۔ قصبہ کے لوگ میلہ دیکھنے تانگے پر جایا کرتے تھے۔ مجید نظامی بھی وہ میلہ دیکھنے تانگے پر جایا کرتے تھے۔ عقل وخرد کے چشمے کی پیاس بجھانے کے لئے اور حکمت کے لعل و گوہر چننے کے لئے تانگے پر پیر صاحب کے میلے کی طرف کا یہ سفر ضروری بھی تھا۔ دل کے درخت کو ثمر آور کرنے کے لئے انگوروں اور خوشبوؤں کے باغ کا راستہ کسی ایسی ہی جگہ سے نکل سکتا تھا اسی لئے تو نواز شریف کے دور حکومت میں ایک مرتبہ انہوں نے مجید نظامی کو اپنے ساتھ ہیلی کاپٹر پر سانگلہ ہل چلنے کی دعوت دی کیونکہ نواز شریف سانگلہ ہل کے دورے پر جا رہے تھے تو مجید نظامی نے جواب دیا کہ میری اور آپ کی تعلق داری ہے لیکن میں اپنے شہر کے لوگوں پر یہ رعب ڈالنا نہیں چاہتا کہ میں وزیر اعظم کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں سے نکلا ہوں۔

مجید نظامی ہوا کے تھپیڑوں کی "پرشکوہ" پرواز سے بچنا چاہتے تھے وہ اپنا مسکن آسمان کا تخت نہیں بنانا چاہتے تھے انہیں تو اپنے محلے کی گلیوں اور گھر کے چولہے کی آگ سے محبت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی سورج کی روشنی میں سانس لینے کا نام ہے اور زمین پر پاؤں کے لمس کو چھونے والی مٹی میں ہی سکون حاصل ہوتا ہے۔ ہواؤں کی سرزمین سے اپنے قصبے کی مٹی پر اترنا انہیں گوارا نہ ہوا۔ مجید نظامی وطن کے ساتھ ماں کی محبت کی طرح عمر بھر چمٹے رہے۔ بعد میں نواز شریف مجید نظامی سے کہنے لگے کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ مجید نظامی نے کہا کہ سانگلہ ہل میں کارپٹ کی ایک انڈسٹری موجود ہے اس کے علاوہ جننگ فیکٹریز بھی ہیں آپ فی الحال دو ٹیکنیکل سکول بنوا دیجئے۔ لہٰذا نواز شریف نے بچوں کے لئے ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور لڑکیوں کے لئے بھی ایک فنی سکول کا اعلان کیا۔ لڑکیوں کا فنی سکول کام کر رہا ہے۔ لڑکوں کے انسٹی ٹیوٹ کے لئے زمین مل گئی ہے لیکن نواز شریف اور شہباز شریف دونوں رخصت ہو گئے اسی وجہ سے زمین یونہی پڑی رہ گئی تھی لیکن مجید نظامی اسے مکمل کروانے کا عزم رکھتے تھے لہٰذا وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی سے رابطہ کرنے کے بعد وہ سکول اب زیر تعمیر ہے۔

تیسرا باب

سرتاج عزیز "دواور دو چار" کا چکر

آبائی قصبے سانگلہ ہل میں مجید نظامی کے بڑے بھائی بشیر نظامی ہی مستقل قیام پذیر ہوئے جو "بک سیلر" تھے اور مسلم اخبارات کے ایجنٹ بھی تھے جن میں "زمیندار" "احسان" "شہباز" اور بعد میں "نوائے وقت" بھی شامل ہوا۔ مجید نظامی کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بڑے بھائی حمید نظامی نے میٹرک میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تو وظیفہ مقرر ہو گیا اور وہ اسلامیہ کالج لاہور آ گئے۔ 1938ء میں حمید نظامی نے بی اے کا امتحان پاس کر لیا اور ایف سی کالج میں ایم اے انگلش میں داخلہ لے لیا۔ حمید نظامی کا لکھنے کی طرف طبعی رجحان تھا۔ آپ کے طبع زاد افسانے، ہلکے پھلکے مضامین اور قلمی خاکے "شیرازہ" "ہمایوں" اور ادبی دنیا میں چھپتے رہے۔ اسلامیہ کالج میگزین "فروغ مشرق" کی ادارت کے فرائض بھی حمید نظامی سرانجام دیتے رہے۔

لیکن پھر آپ نے ادب کی دلنوازی کو خیر آباد کہہ کر سیاست کے میدان کارزار میں قدم رکھ لیا۔ ابھی طالب علمی کی سرحد بھی پار نہیں کی تھی کہ 1937ء میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی اور بانی صدر منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھیوں میں الیاس قریشی، راجہ افتخار اللہ وغیرہ نمایاں تھے۔ اس سے پہلے حمید نظامی کالج کی یونین کے سیکرٹری چن لئے گئے تھے حمید نظامی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ اور جالندھر میں شرکت کی۔ ستمبر 1937ء سے 1938ء کے دوران علامہ اقبالؒ سے ایک سے زائد ملاقاتوں کا شرف بھی حاصل ہوا۔ جن کے وہ روحانی مرید تھے اور آج تک مجید نظامی بھی انہیں اپنا مرشد قرار دیتے ہیں۔ اسی دوران وہ عملی صحافت میں بھی قدم رکھ چکے تھے۔ قائداعظمؒ کی نظر فراست اس نوخیز نوجوان کی صلاحیتوں اور جولانیوں کو بھانپ چکی تھی۔ قائداعظمؒ کی ایماء اور احباب کے تقاضوں پر آپ نے ''مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کی دوبارہ صدارت سنبھالی تھی آپ نے 23 مارچ 1940ء کو پندرہ روزہ نوائے وقت جاری کیا۔ یہ دن پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی روز لاہور میں ''قرارداد پاکستان'' منظور ہوئی تھی۔ نوائے وقت کا اجراء بھی آزادی کی جدوجہد میں مقاصد کے حصول کی طرف ایک قدم تھا اور اس کے علاوہ ایک مقصد اردو کی ترویج بھی تھا۔

مجید نظامی بھائیوں میں تیسرے نمبر پر ہیں۔ چھوٹی ہمشیرہ مجید نظامی سے بڑی تھیں انہوں نے سانگلہ ہل میں اپنی تعلیم عیسائیوں کے امریکن مشن سکول میں مکمل کرنے کے بعد فاطمہ جناح کالج (پرائیویٹ) لاہور میں داخلہ لیا یہ کالج ملتان روڈ پر تھا اور فاطمہ بیگم اس کالج کی پرنسپل تھیں جو تحریک پاکستان کی ورکر بھی رہی تھیں۔ مجید نظامی کی ہمشیرہ نے بی اے بی ٹی تک تعلیم مکمل کی اور سمن آباد کے سکول میں ہیڈ مسٹریس تعینات ہوئیں۔ ان کی ریٹائرمنٹ سے پہلے اس سکول کو کالج کا درجہ دے دیا گیا تھا لہٰذا وہ ہیڈ مسٹریس کم پرنسپل کا فریضہ سرانجام دیتی رہیں۔ مجید نظامی کی بڑی ہمشیرہ جلدی شادی ہونے باعث سیالکوٹ کی ہی ہو کر رہ گئیں تھیں جبکہ چھوٹے بھائی خلیل نظامی ایف اے تک تعلیم حاصل کر سکے اور نوائے وقت کے پریس منیجر بنے۔ مجید نظامی

اپنے بہن بھائیوں میں واحد حیات ہیں اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور باایمان زندگی سے نوازے رکھے (آمین)۔

مجید نظامی کی ایک ہی صاحبزادی رمیزہ ہیں جو انہیں ''عزیز ترین'' ہیں اس سے وہ روزانہ رات کو فون پر بات کرتے ہیں اور اس کی باتیں سن کر دلی سکون حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح دن بھر کی تھکن دور کر کے آرام کی نیند سوتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے خوش خوشحال زندگی نصیب کرے اور وہ بھی اپنے بابا کا مشن جاری رکھے اور قائدؒ و اقبالؒ کا پاکستان بنانے کے لئے خود کو وقف کر دے۔ رمیزہ لندن میں پولیٹیکل سائنس میں گریجویشن کر رہی ہیں۔

حمید نظامی مرحوم کے پانچ بچوں میں عارف نظامی Mass Comunication میں ڈگری لینے کے بعد ''نیشن'' کے ایڈیٹر اور ''نوائے وقت'' کے ایگزیکٹو ایڈیٹر ہیں۔ نوائے وقت گروپ اب ''وقت'' ٹیلی ویژن چینل کی بھی تیاری کر رہا ہے جو انشاء اللہ اگلے عام انتخابات سے پہلے اپنی بسم اللہ کر دے گا۔ بیگم حمید نظامی کا انتقال ہو چکا ہے۔ حمید نظامی کے ساتھ ان کی شادی 1943ء میں ہوئی تھی اس وقت ہر طرف ''تحریک پاکستان'' کا چرچا تھا اور حمید نظامی اس تحریک کی کامیابی کے لئے دن رات کوشاں تھے۔ حمید نظامی کو اپنی دعاؤں کو مستجاب اور آزادی کی آرزو کی تکمیل کرنا تھی۔ وہ مقصد سے جڑے ہوئے منظر کو کسی دھند کا شکار نہیں ہونے دے سکتے تھے۔ ان کی محبت کے رنگ مذہب و ملت کی پاسبانی کے رنگوں میں بدل چکے تھے۔ بیگم حمید نظامی جو علی گڑھ کی گریجویٹ تھی زندگی کی شروعات میں ایسے بلند اسرار کے رموز سے ناآشنا تھیں لیکن بعد میں وہ سمجھ گئیں کہ حمید نظامی وہ مفکر ہے جو جہالت اور بے حسی کے تنگ و تاریک غار میں گزر بسر نہیں کر سکتا لہٰذا رفتہ رفتہ انہوں نے خود کو حمید نظامی کے مطابق ڈھال لیا۔ بیگم حمید نظامی اپنی نجی نگارشات کی روشنی میں کہتی ہیں کہ ''1947ء میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی کشیدگی بہت بڑھ چکی تھی ہم لوگ ان دنوں بیڈن روڈ پر رہائش پذیر تھے۔ نظامی صاحب نے اسی میں عافیت سمجھی کہ مجھے وزیر آباد بھیج دیا جائے تاکہ وہ دوست احباب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت تحریک پاکستان

کیلئے صرف کر سکیں۔" چونکہ یہ 1947ء کے واقعات ہیں لہٰذا سوچا جا سکتا ہے کہ حمید نظامی جیسے عہد ساز شخصیت اور بلند سیرت کے لئے کتنا کٹھن مرحلہ تھا۔

غنچے کھل کر پھول بنتے ہیں اور خوشبو دور دور تک پھیل جاتی ہے چاند اور سورج آہستہ آہستہ اپنے طے شدہ راستے طے کرتے ہیں۔ مجید نظامی درجہ نہم کے بعد لاہور آ گئے اور میٹرک پرائیویٹ کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ایف اے میں آرٹس کے مضامین کا انتخاب کیا۔ عمر حیات ملک کالج کے پرنسپل تھے جن کا تعلق پشاور سے تھا فارسی کے استاد علم الدین سالک اور اکنامکس کے خواجہ اسلم تھے۔ عبدالبشیر آذری بھی مجید نظامی کے اساتذہ میں شامل تھے یہ وہ زمانہ تھا جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ تحریک کے جلسہ جلوسوں میں شرکت کے باعث طالب علموں کو بغیر امتحان دیئے ہی ایف اے کی اسناد دی گئی مگر مجید نظامی نے تحریک پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا اور باقاعدہ امتحان میں حصہ لے کر کامیابی حاصل کر کے ایف اے کی سند حاصل کی۔ انکے اکثر ساتھیوں نے یہ سند اعزازی طور پر یونیورسٹی سے حاصل کی کیونکہ انہوں نے تحریک پاکستان میں عملی طور پر حصہ لیا۔

مجید نظامی کے بارے میں بڑے بھائی حمید نظامی کی خواہش تھی کہ وہ بی کام کریں جبکہ مجید نظامی دو اور دو چار کے چکر میں نہیں پڑ سکتے تھے لہٰذا بھائی کو بتائے بغیر تھرڈ ائیر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور بی اے مکمل کیا۔ سابق وزیر خزانہ سرتاج عزیز مجید نظامی کے دوستوں میں ہیں اور اسلامیہ کالج کے بعد بی کام میں بس تھوڑی دیر کیلئے ایک ساتھ پڑھتے رہے تھے۔ سرتاج عزیز نے بی کام مکمل کیا جبکہ مجید نظامی نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کر کے ایم اے پولیٹیکل سائنس میں تعلیم مکمل کی اور اپنے "کیریئر" کو تبدیل کر کے اپنی سمت کا خود تعین کیا۔

کالج کا زمانہ نوعمری کا زمانہ ہوتا ہے یہ زمانہ روشن دنوں کا لباس پہن کر طلوع ہوا کرتا ہے مگر ظلم اور استحصال کے سامنے سینہ سپر طالب علموں کی خوش خیالی کو کانٹوں سے آراستہ کر دیا گیا

تھا۔ ہر طرف خود غرضی کے ڈیرے تھے ایسے میں سرمئی آنکھوں اور ارغوانی ہونٹوں کے پیچھے آزادی کا ایسا خواب دل آویز تھا کہ جس کے لئے ہر دل دھڑک رہا تھا۔ مجید نظامی بھی تحریک پاکستان کی جدوجہد میں عملی طور پر شریک تھے۔ تحریک پاکستان میں یوں بھرپور شرکت کرنا گھر کے ماحول، نوائے وقت اخبار اور پھر اسلامیہ کالج کی تربیت کی وجہ سے بھی تھا جو اس وقت کی صف اول کی قومی درسگاہوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

مجید نظامی کے بچپن کا زمانہ چونکہ تقسیم ہند سے پہلے کا زمانہ ہے۔ لہٰذا ان کے دوستوں میں ''مدن لعل'' اور ''درشن سنگھ'' بھی شامل تھے۔ مدن لعل کی تو خبر نہیں کہ کہاں گیا۔ البتہ درشن سنگھ خالصہ کالج لاہور میں آ گیا تھا لہٰذا مجید نظامی کی ملاقاتیں درشن سنگھ سے ہوتی رہیں۔ پارٹیشن کے بعد وہ ''دلی'' چلا گیا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ ''کمیونسٹ'' ہو گیا ہے اور اس نے ''رشین ایمبیسی'' میں ملازمت بھی حاصل کر لی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ''کمیونسٹ'' ملازمت حاصل کرنے کیلئے تو نہیں ہوا تھا۔ بہرحال اب درشن سنگھ ریٹائرڈ مگر خوشحال زندگی بسر کر رہا ہے۔ کچھ وقت اپنی دھرم پتنی کے ساتھ آ کر میسن روڈ پر لاھور میں مجید نظامی کی فیملی کے ساتھ گزار گیا ہے۔ البتہ مجید نظامی کبھی دہلی نہیں گئے۔ ان کے ''کامن'' فرینڈ سرتاج عزیز دلی جاتے ہیں تو درشن سنگھ کو ضرور ملتے ہیں اور ان کی خیریت کی خبر لاتے رہتے ہیں۔ کالج کے زمانے میں چوہدری عبدالحفیظ مجید نظامی کے بہت گہرے دوست تھے۔ ان کے والد چوہدری عبدالکریم گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے۔ وہ پکے مسلم لیگی اور مقامی سول مسلم لیگ کے صدر تھے۔

تحریک پاکستان کے اولین شہید عبدالمالک اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں مجید نظامی کے کلاس فیلو تھے۔ جو تحریک پاکستان کیلئے اپنی ہستی سے بے نیاز ہو کر مقصد کے حصول کو ہی انجام حیات سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو ہی فراموش کیے ہوئے تھے اور وارفتگی کے عالم میں دل صد پارہ میں ایک عزم آہنی کے ساتھ آزادی کی شمع کو بوسہ دینے کی تمنا کو لیے رواں دواں تھے اور قبولیت قربانی کیلئے دست دعا تھے کہ طلبا کے ایک جلوس کے دوران ''لے کے رہیں گے پاکستان''، ''بن کے

رہے گا پاکستان'' کے نعروں کے درمیان سناتن دھرم کالج لاہور (موجودہ ایم اے او) لاہور کے چھت پر ہندو طلباء کی خشت باری کی وجہ سے جام شہادت نوش فرما کر ''شہیدان وفا'' کے پہلو میں چلے گئے۔ اس وقت مجید نظامی عبدالمالک کے شانہ بشانہ تھے اور وہ پتھر یا اینٹ جو عبدالمالک کو لگی تھی مجید نظامی کو بھی لگ سکتی تھی۔

عبدالمالک شہید کے خون سے رنگی ہوئی اپنی قمیض مجید نظامی نے لندن جانے سے پہلے 1954ء تک اپنے پاس محفوظ رکھی۔ عبدالمالک تیز ہوا کے دوش پر آنے والی ''اینٹوں'' کی وجہ سے چراغ کی طرح ٹمٹما کر بجھ گیا۔ آزادی کے حصول کی اس قسم کی عظیم تحریکوں میں سرد و گرم چشیدہ ہونے کیلئے مصائب کے پہاڑ اٹھانے ہی پڑتے ہیں۔ مگر جواں جذبے دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ عبدالمالک شہید بھی تحریک پاکستان کے ''پہلے'' شہید کا خطاب حاصل کر کے امر ہو گئے۔ ان کا مزار اسلامیہ کالج لاہور میں ہے اور مجید نظامی تحریک پاکستان کے ''برٹیفائیڈ مجاہد'' بن کر تین چار مرتبہ ''بائی پاس'' کے کٹھن مراحل سے گزرنے کے باوجود تا حال نظریہ پاکستان کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ انہیں اسلامیہ کالج میں باقی ساتھیوں کیساتھ سیکرٹری جنرل آل انڈیا مسلم لیگ لیاقت علی خان کے ہاتھ سے ایک تلوار کیساتھ ملا تھا۔ یہ سرٹیفکیٹ ان کے دفتر کے کمرے میں آویزاں ہے جسے وہ زندگی کا سب سے بڑا سرٹیفکیٹ قرار دیتے ہیں۔ ان طلباء نے 46ء کے الیکشن میں کام کیا تھا۔ کالج کے پرنسپل عمر حیات ملک نے انہیں اس کام کے لئے فری کر دیا تھا۔ اور پنجاب میں مسلم لیگ کی کامیابی کے بعد میں قیام پاکستان ممکن ہوا تھا اس لحاظ سے اسلامیہ کالج کا بڑا تاریخی رول ہے۔ اس روشنی کی طرح جسے تاریکی چھپا نہیں سکتی۔ اس بادل کی طرح جو چمن حیات میں وطن کی محبت کے پھولوں کو سیراب کرتا رہتا ہے۔ خدا ایسے جاں فروش پروانوں کی حفاظت خود کرتا ہے۔

دل غمیں کے موافق نہیں ہے موسم گُل



چوتھا باب

جنرل صاحب......ٹینک پر جانا پڑے گا!

تلاش کا سفر مخفی اسرار سے ان کے معانی پوچھنے پر مجبور کر دیتا ہے روشنی کو تلاش کرنے لئے آسمانوں کی طرف دیکھنا ہی پڑتا ہے یہ 1954ء کا دور تھا جب مجید نظامی بمبئی کے راستے بحری جہاز کے ذریعے لندن کے لئے روانہ ہوئے۔ مجید نظامی کا انڈیا جانے کا تو نہیں لیکن لندن براستہ بمبئی جانے کی مجبوری کی وجہ سے بندرگاہ کو ٹچ کرنے کا یہ پہلا اور آخری اور وہ بھی ''بادل نخواستہ'' اتفاق تھا۔ جس طرح قائداعظمؒ ہندو قیادت کی عیاری اور مکاری کو خوب جان گئے تھے اور اس سلسلے میں کوئی بھی انہیں دھوکہ نہیں دے سکتا تھا اسی طرح مجید نظامی کو بے انتہا ''پاکستان دوستی'' نے ہندوستان کا دشمن بنا دیا 1962 سے لیکر آج تک مجید نظامی کے زیرادارت نوائے وقت ہندوستان کے جارحانہ عزائم کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک مرتبہ ضیاء الحق مجید نظامی کو اپنے ہمراہ بھارت لے کر جانا چاہتے تھے۔ مجید نظامی نے کہا:

بھارت تو میں اس وقت جاؤں گا...... جب آپ ٹینک پر بیٹھ کر جائیں گے۔

تو کہنے لگے۔

یہ تو ابھی مشکل ہے۔ طاقت نہیں ہے۔

مجید نظامی نے برجستہ کہا

تو پھر آپ جائیں میری کوئی مجبوری نہیں ہے۔ لہٰذا جب ''طاقت'' ہو گی یاد فرمائیں...... بندہ حاضر ہوگا۔

ایک اور واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مجید نظامی نے بتایا کہ میں ضیاء الحق کے ساتھ ''سری لنکا'' میں تھا۔ اچانک ان کا وہیں سے انڈیا جانے کا پروگرام بن گیا یا ممکن ہے پہلے سے ہی بن چکا ہو تو کہنے لگے۔

مجید نظامی صاحب! اب تو آپ کو انڈیا جانا ہی پڑے گا مجید نظامی نے کہا

میری کوئی مجبوری نہیں آپ انڈیا جانا چاہتے ہیں تو جائیں...... میں کسی بھی کمرشل فلائٹ سے پاکستان چلا جاؤں گا۔

لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بیگم ضیاء الحق کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی لہٰذا وہ طیارہ انہیں واپس پاکستان لے کر آیا۔ جس میں اور چند لوگوں کے علاوہ مجید نظامی بھی ان کے ہمراہ پاکستان واپس آ گئے اور جنرل ضیاء الحق کو کمرشل فلائٹ سے سری لنکا سے جہاز مانگ کر انڈیا تک کا سفر کرنا پڑ گیا۔

مجید نظامی کا بمبئی سے لندن تک جانے کا سمندری سفر چھ ہفتے کی طوالت پر مشتمل تھا کبھی لہریں محبوب اور کبھی برہمی کی آخری حدوں کو چھو لیتی تھیں۔ کبھی جوار بھاٹا مغلوب کرنے پر تل جاتا اور کبھی یوں محسوس ہوتا کہ سمندری پریاں ستاروں کا نظارہ کرنے سطح آب پر نمودار ہو چکی ہیں۔ سمندر کی برہمی کے دوران ہی مجید نظامی کو ''طوفان'' سے واسطہ پڑا جب ایک ایک لہر بلند و

بالا دیو کی طرح جہاز کے چاروں طرف ٹکراتی تھی۔ شعلہ جوالہ سمندر سینہ بحر پر تیرتے ہوئے جہاز کو نگلنے کے لئے تیار تھا۔ جہاز ننھی سی کشتی کی طرح ہلکورے لے رہا تھا اور لوگ ہر جنبش پر سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ لندن کے اس سفر میں جہاز کا پہلا پڑاؤ ''عدن'' اور دوسرا ''سکندریہ'' تھا سکندریہ کے ساحل پر کھڑے ہوئے مجید نظامی دیر تک ان نسلوں کے بارے میں سوچتے رہے جو نہر سویز کے ساحل سے گزری تھیں اور اُن حکمرانوں کو یاد کرتے رہے جو ابوالہول کی وحشت کے سامنے کھڑے رہے اور ان تمام غیرت مند افراد کو چشم تصور سے دیر تک دیکھتے رہے۔ نہر سویز کو پار کرنے کے دوران سفر میں ایک سرے پر اتر کر قاہرہ جانے کی سہولت تھی۔ دوسرے سرے پر جہاز پکڑا جا سکتا تھا۔ مجید نظامی نے بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا ''مسجد الازہر'' قاہرہ کا ''عجائب گھر'' اور ''اہرام مصر'' بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر میں مجید نظامی کے ہمراہ قادیانیوں کے سربراہ کا بیٹا بھی تھا جن کے ساتھ ان کے اب تک ''غائبانہ'' مراسم رہے ہیں۔ قاہرہ انہوں نے بعد میں بطور صحافی مدیر دو تین بار جب انہیں سربراہان مملکت کیساتھ جانے کا موقع ملا، خوب دیکھا۔ ایک بار مسلم لیگ (ن) کے موجودہ چیئرمین جناب راجہ ظفر الحق وہاں سفیر پاکستان تھے۔ قاہرہ کے کیفے، قہوہ خانے اور نائٹ کلب بھی دیکھے۔ عام مصریوں کے رہن سہن کا مطالعہ بھی کیا۔ مصر کے آخری بادشاہ کا محل بھی دیکھا جو اس وقت صدر ناصر کے زیر استعمال تھا۔ وہ کہتے ہیں جس طرح ہمارے حکمرانوں نے انگریزوں کے چھوڑے ہوئے ایوان صدارت اور گورنر ہاؤس نہیں چھوڑے اسی طرح باقی محکوم مسلمان حاکموں نے پرانے پیلس خالی نہیں کیے۔

لندن میں مجید نظامی کو مرحوم نسیم احمد نے رسیو کیا۔ نسیم احمد ''ڈان'' کے نمائندہ تھے اور لاہور ایف سی کالج کے سابق طالب علم تھے۔ نسیم احمد نے مجید نظامی کی رہائش کا انتظام سینٹرل لندن کے بارونق اور مشہور چیلسی کے پڑوس میں واقعہ معروف ایریا "Earl's Court" کے ایک ہوٹل میں کر رکھا تھا اس ہوٹل میں مجید نظامی نے دو سال تک قیام کیا اور وہیں سے ''مکتوب لندن'' بھی لکھا کرتے تھے یہاں سے ہی مجید نظامی کو صحافت میں عملی طور پر شرکت کرنے اور سیکھنے کا موقع بھی میسر آیا۔ مجید نظامی ڈیلی بریفنگ کے لئے فارن آفس جاتے اور فلیٹ سٹریٹ بھی

جاتے جہاں پاکستان کے حوالے سے ملنے والی خبریں "فائل" کرتے۔ اس کے علاوہ دولت مشترکہ اور برطانیہ کے حوالے سے خبریں جمع کرتے اور سیاسی امور، بین الاقوامی حالات اور لندن کی معاشرتی زندگی کے معمولات کو ہلکے پھلکے انداز میں نوک قلم پر لاتے وہ کامن ویلتھ کارسپانڈنس ایسوسی ایشن اور کامن ویلتھ پریس یونین کے بھی رکن رہے۔اوسز کورٹ میں زیادہ وقت انہوں نے "کوریلو کافی ہاؤس" میں گزارا جہاں اکثر پاکستانی دوست گپ شپ کے لئے جمع ہوتے تھے اور کم سے کم تین دوستوں نے تو یہیں سے اپنی اپنی رفیق حیات "دریافت" کیں۔ مجید نظامی کہتے ہیں یہاں کی بلیک کافی کے ضرورت سے زیادہ استعمال نے میرے ہاتھوں کو کانپنے پر مجبور کردیا۔لیکن میں نے فوراً کافی کم کردی اور اسی اعتدال نے مجھے جوانی میں ہی رعشے سے بچا لیا۔لیکن کافی مجھ سے آج تک نہیں چھوٹی۔ بارہ بجے ایک پیالی کافی دودھ میں پانی کے بغیر ضرور پیتا ہوں۔

لندن کے سفر پر روانہ ہونے تک مجید نظامی کی والدہ حیات تھیں اور لاہور میں مقیم تھیں۔ 1958ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کے دور میں مجید نظامی کو لائلپور میں ایک سیمینار میں بحیثیت جرنلسٹ شرکت کرنے براستہ لاہور روانہ ہوئے۔ اس وقت مجید نظامی لندن نوائے وقت کے خصوصی نمائندہ بھی تھے۔ لائلپور جاتے ہوئے لاہور میں مجید نظامی نے ایک دن کا مختصر قیام کیا۔ والدہ حسین بی بی گنگا رام ہسپتال کے پرائیویٹ روم میں علالت کے باعث داخل تھیں۔ مجید نظامی نے دیکھا کہ ماں واقعی کمزور اور مضمحل دکھائی دے رہی تھیں۔ راستہ دکھانے والی آنکھیں افسردہ تھیں۔ شفیق ماں دیر تک مجید نظامی کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ مختصر ملاقات میں نظروں کی پیاس اسی طریقے سے بجھائی جا سکتی تھی .... کیونکہ آنکھیں جانتی تھیں کہ جدائی کے طویل سفر کا آغاز ہونے کو ہے۔ مجید نظامی ماں کے پاؤں کو بوسہ دے کر لائلپور کے لئے روانہ ہو گئے اور کچھ دنوں میں ایک پرندہ آسمان کی طرف اڑ گیا۔ لیکن مجید نظامی نے آج بھی ماں کی تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے بیڈروم میں بھی رکھی ہوئی ہے اور اس سے بدستور اسی طرح شفقت و پیار حاصل کرتے ہیں جس طرح ان کی حیات میں کرتے تھے۔

پانچواں باب

''ہوائے ہوشربا''

سانگلہ ہل سے لندن جانے والے مجید نظامی کو لندن کا شہر خوباں کچھ زیادہ عجیب و غریب یا انوکھا محسوس نہیں ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ لندن لاہور سے کچھ گنا بڑا ہے اور بس۔۔۔۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ 1944ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد 1954ء تک کا عرصہ انہوں نے لاہور میں شہر کی سیاسی، ادبی اور سماجی سرگرمیوں کا حصہ بن کر بھرپور انداز میں گزارا تھا۔ لاہور کے ہوٹلوں کی شامیں اس وقت آباد ہوا کرتی تھیں۔ ''میٹرو ہوٹل'' جو کہ موجودہ واپڈا ہاؤس ہے یا پھر شاہ دین بلڈنگ کا ''لورنگیز'' اور اس سے ذرا پرے ''شیفلو'' روحانی کھیتوں کو سیراب کرنے اور انہیں ثمر ور کرنے کا کار خیر سرانجام دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ ریگل سینما چوک کے بالکل کے

ساتھ ''سٹینڈرڈ ریستوران'' میں باقاعدہ ''کبھرے'' ڈانس ہوا کرتا تھا۔ یہ ڈانس ''میٹرو'' ہوٹل میں بھی ہوا کرتا تھا۔ ان جگہوں کے علاوہ ''پاک ٹی ہاؤس''، ''کافی ہاؤس'' اور ''باغ جناح'' لاہور کی ''سوشل'' زندگی کا عکس تھے اور مجید نظامی کی زندگی کا حصہ تھے۔ اس دور میں مجید نظامی کی حیات یوں تقسیم تھی کہ جواں جذبوں کی گداز دھڑکنوں میں باہم و گرہم جذبات ذاتی خواہشات کے دھاروں کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے ''تحریک پاکستان'' کی سرگرمی کے ساتھ قائم و دائم ہو چکی تھی۔ مجید نظامی کو اگر اپنی ہستی کہیں نامکمل بھی محسوس ہوتی تو ایک مکمل قوم کا خواب ان کی ذات کو پشیمانی کے کسی جذبے میں مبتلا نہیں ہونے دیتا تھا۔

کتاب حیات کے اوراقِ پارینہ پر رقصاں یہ مناظر قلب و جگر کو بھرمانے کیلئے نقوش دل کی گہرائیوں میں عمر بھر درخشاں رہے۔ یہ واقعات اتنے اہم ہیں کہ محض ''رفت'' اور ''بود'' پر مبنی نہیں بلکہ جاودانی ہیں اور اپنی حقیقت کو خوشبو کی طرح آج تک ہواؤں میں بکھیر رہے ہیں۔

مختلف سمتوں پر سفر کرنے والے مجید نظامی کوئی بھی رستہ گم کیے بغیر منزل مقصود تک پہنچ جانے کا حوصلہ رکھتے تھے لہٰذا ہر راستے پر سے خوش خرامی سے گزرنے کا طریقہ اور سلیقہ جاننے والے قدم کٹھن راستوں کے مدارج بخوبی طے کرتے چلے گئے۔ ''معاف کرنا'' کا صیغہ گفتگو کے ابتداء میں بول کر شعلہ آتشیں کے حصار میں تند الفاظ کی تلوار ہالہ بربریت کے سینے میں اتار دینا، طنزیہ اور ناصحانہ انداز گفتار میں مقصد حیات کا رشتہ روح کے ساتھ پابہ زنجیر کرنا اور پھر یہ بھی سمجھ لینا کہ بہار کے جھونکے یہ کیا سرگوشی کرتے ہیں کہ گلاب کی پنکھڑیاں فرط حیرت سے نیم وا آنکھیں کھول دیتی ہیں۔

زندگی کے ساتھ وصال کا یہ کمال محال تھا مگر مجید نظامی نے لاہور کے شب و روز کی کیفیات سے سیکھ لیا تھا۔ اسی لیے لندن اتنا سا بدلا ہوا محسوس ہوا کہ گندمی رنگ کی جگہ گورے رنگ نے لے لی۔ خواتین کی ''شلوار'' کی جگہ ''سکرٹ'' اور مردوں نے ''پتلون'' پہن رکھی تھی۔ اگرچہ شلوار قمیضوں کی بھی کمی نہیں تھی کیونکہ لندن میں پاک بھارت کے ہزاروں مسلمان، ہندو، سکھ آباد

تھے بہرحال لباس کا یہ انداز بھی شاید موسموں کی وجہ سے ناگزیر تھا۔اس لباس میں انہوں نے خود بھی یونیورسٹی اوراس سے پہلے گورنمنٹ کالج میں وقت گزارا تھا۔بی اے میں ان کی ایک کلاس فیلو جواینگلوانڈین تھیں جو مال روڈ سے سائیکل پر آیا کرتیں تھیں اور سکرٹ میں نظر آتی تھیں۔ایم اے پولیٹیکل سائنس کے شعبہ میں تو لڑکیوں کی بھرمارتھی۔

لندن میں قیام کے دوران مجید نظامی نے زندگی کی تاریکی اور روشنی کے گرد چکر لگائے۔لندن کی عالی شان عمارتوں، پیرس کی سیرگاہوں، پھولوں کی سرزمین ہالینڈ کے علاوہ برسلز، زیورچ، میونخ، ماسکو اور برلن میں گہرے مشاہدات حاصل کیے ان دنوں ''ایسٹ'' اور ''ویسٹ'' برلن الگ الگ ہوتے تھے۔

کائنات کی وسعتوں کے خالق نے اس سعادت کے لائق مجید نظامی کو سمجھا کہ وہ اپنے وجود کی کشتی کو بادمخالف کی مخالفت اور بادموافقت کی موافقت سے بے نیاز ہوکر آگے بڑھاتے چلے جائیں۔سو مجید نظامی کی وسعت نظری میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔لندن میں اپنے قیام کے عرصے میں ہی مجید نظامی نے دوکورسز میں داخلہ لیا۔ایک ''انٹرنیشنل افیئرز'' اور دوسرا ''بارایٹ لاء'' کا تھا جو بڑے بھائی حمید نظامی کی علالت کی وجہ سے مکمل نہ کرسکے۔پہلا کورس ان کا ''فیورٹ'' تھا لہٰذا انہوں نے اعلیٰ اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔اس دور کے استاد ڈاکٹر شوازن برگر پروفیسر کیٹن وغیرہ انہیں اب بھی یاد آتے ہیں۔ڈاکٹر شوازن برگر ''انٹرنیشنل افیئرز'' کے شعبہ کے ہیڈ بھی تھے انہوں نے کورس کے خاتمہ پر اپنے گھر طلباء وطالبات کو الوداعی پارٹی بھی دی جس میں مجید نظامی نے اپنی اہلیہ کے ساتھ شرکت کی تھی۔

پردیس میں رہ کر لوگ اگر اپنے گوشہ تنہائی میں مقید ہوجائیں تو جلاوطن نظر آنے لگتے ہیں۔مجید نظامی نے لاہور کی طرح لندن کی زندگی کا بھی قرینے کے ساتھ لطف اٹھایا مگر ساتھ ساتھ ''مکتوب لندن'' لکھنے اور تعلیمی مدارس طے کرنے کا سلسلہ بھی جاری وساری رہا۔لاہور میں بھی جب وہ بی اے کے طالب علم تھے تو فرصت کے اوقات میں گورنمنٹ کالج کے مشہور ''اوول''

گراؤنڈ کے بنچ پر بیٹھ کر "سرراہے" کا کالم مکمل کیا کرتے تھے اور یہ کالم انہوں نے گورنمنٹ کالج کی لائبریری میں بیٹھ کر بھی لکھے۔ انہوں نے یہ کالم حمید نظامی صاحب کی نگرانی میں چار سال تک لکھے۔ ان کی زیر ہدایت کبھی کبھی شذرہ بھی لکھا کرتے تھے یہ ان کی صحافتی ٹریننگ کا زمانہ تھا مگر زندگی کی خوبیوں اور خوشیوں سے مسرور ہوتے ہوئے ہوائے ہوشربا نے مجید نظامی کو جب اپنا رفیق بنانا چاہا تو تنہا رہنے کی "آزادی" کے خوش آئند لفظ کو انہوں نے اپنی ذات سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر کے برادر کلاں حمید نظامی سے کہا کہ بہتر ہے کہ میری شادی کر دی جائے ...... اپنی من پسند زندگی کی تخت نشینی سے دستبردار ہونے کا یہ انداز بھی مجید نظامی کا حصہ ٹھہرا اور احتیاط پسندی میں اپنی "ذات" کی خود حفاظت کرنے کا یہ طریقہ خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ مجید نظامی نے اپنی روح کو بے بال و پر ہونے سے خود ہی بچا لیا تھا اور مزید صداقت سے کام لیتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ چونکہ میں نے پاکستان آنے کیلئے "کرایہ" جمع نہیں کیا ہوا اور میں نہیں چاہتا کہ آپ پر "دوہرا" خرچ ڈالوں ۔۔۔ حمید نظامی سمجھدار تھے وہ سمجھ گئے کہ اگر "یہاں" کچھ نہ کچھ نہ کیا گیا تو "وہاں" کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ حمید نظامی کی مشکل مجید نظامی کے دوست سابق وزیر خزانہ سرتاج عزیز کی بڑی ہمشیرہ مسز نثار عزیز بٹ نے حل کر دی اور یہ رشتہ طے کروا دیا۔

ریحانہ بیگم ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے ڈائریکٹر اصغر بٹ کی ہمشیرہ تھیں اور اس وقت ایم اے اکنامکس کی طالبہ تھیں۔ شادی طے ہو جانے کے باعث انہیں ایم اے فائنل ایئر سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑ گیا ۔۔۔ مجید نظامی کہتے ہیں کہ نہ جانے انہوں نے قربانی دی یا اللہ کا شکر ادا کیا کہ پڑھائی سے جان چھوٹی ۔۔۔ یہ ہلکا پھلکا انداز مزاح مجید نظامی کی شخصیت کا خاصہ ہے۔

رشتہ طے ہو جانے کے بعد یہ صورتحال تھی کہ مجید نظامی لندن میں تھے لہٰذا مولوی صاحب سے مشورہ کر کے "پاور آف اٹارنی" برادر بزرگوار حمید نظامی کو سونپی گئی۔ اور یوں رسم نکاح ادا ہونے کے بعد ۔۔۔ اکتوبر 1956ء میں بغیر "دولہا" کے "بارات" راولپنڈی کیلئے روانہ ہوئی نہ جشن کا سماں تھا نہ ڈھولک کی آواز نہ قہقہے نہ چراغاں نہ نوجوان لڑکوں نے نغمے الاپے اور نہ

ہی لڑکیوں نے خوشی کے گیت سنائے نہ بیش قیمت غالیچوں کی ضرورت پڑی اور نہ زرق برق ساز و سامان سے آراستہ کا اشیاء کا میلہ سجایا گیا تھا مگر عظیم المرتبت شخصیات کا یوں اجتماع تھا کہ ''وزیراعظم نون'' اور کشمیری رہنما'' چوہدری غلام عباس کی ''برات'' میں موجودگی کشاکش حیات کی ہنگامہ آرائیوں سے زیادہ معتبر تھی۔ دلہن کو چند ہی دنوں کے بعد لندن روانہ کر دیا گیا۔ مجید نظامی انہیں لینے کیلئے ''تنہا'' ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ ''دولہا'' اور ''دلہن'' کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔

مجید نظامی ان دنوں ہوٹل سے میر بشیر مرحوم (مشہور پامسٹ) کے گھر آ چکے تھے کیونکہ میر بشیر ان دنوں پاکستان آئے ہوئے تھے۔ لندن میں گھریلو ملازمین تو میسر نہیں ہوتے لہٰذا مجید نظامی نے بیگم کیلئے دعوت کے اہتمام میں ''مٹر پلاؤ'' تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ مٹر ''ٹن پیک'' میں ملتے تھے۔ ٹن کے پانی سے مٹر نکال کر دھو لیے جاتے ہیں اور پھر چاولوں میں شامل کر کے مٹر پلاؤ پکایا جاتا ہے۔ مجید نظامی اس طریقہ کار سے بے خبر تھے انہوں نے چاولوں میں پانی کا ڈبہ مٹر سمیت انڈیل دیا لہٰذا سبز رنگ چاولوں میں بھی آ گیا۔ یوں انہوں نے شادی شدہ زندگی کا آغاز ''گرین پیز پلاؤ'' بنا کر کیا۔

مجید نظامی ہنی مون کیلئے انگلینڈ ویلز، سکاٹ لینڈ اور پیرس گئے۔ بیگم کے آجانے سے مجید نظامی کی زندگی کے معمولات میں بہت زیادہ تبدیلی اس لیے نہ آئی کہ بیگم ریحانہ نے ''ریجنٹ پولی ٹیکنیک'' میں کمرشل آرٹ میں داخلہ لے لیا تھا۔ اور یوں دونوں سارے دن کی مصروفیات کے بعد شام کو ہی ملاقات کر سکتے تھے۔ مجید نظامی کبھی کبھی طے شدہ ٹائم پر ریجنٹ پولی ٹیکنک کی کینٹین پر پر پھرتے پھراتے لنچ کے لئے پہنچ جاتے کیونکہ یہ علاقہ ویسٹ اینڈ کے عین وسط میں آکسفورڈ سرکس کے ساتھ ہی واقع تھا۔

مشرقی خواتین کی طرح ریحانہ بیگم کو بھی بہت سے قربانیاں دینا پڑیں۔ جن دنوں شادی شدہ زندگی کا آغاز ہوا تھا ان دنوں مجید نظامی نہ تو ایڈیٹر تھے اور نہ اخبار کے مالک بلکہ لندن

میں کارسپانڈنٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کی تنخواہ خود اپنے لیے بھی ناکافی تھی۔ اب جبکہ دونوں میاں بیوی طالب علم تھے لہٰذا بسوں میں سفر بھی کرنا پڑتا اور فیسیں بھی بھرنی ہوتی تھیں۔ مگر آرزوؤں کے برآنے کی تمنا کسی غیر مرئی قوت کی طرح روح کو از سر نو تازگی بخشتی رہتی تھی۔ قناعت اللہ تعالیٰ نے ہر دو کو عطا کی تھی۔ لیکن بچت کی عادت کی وجہ سے نئی ''واکس ہال'' گاڑی بھی مل گئی اور یوں پورے یوکے اور یورپ کی سیر بھی کی۔

ذہنی رفاقت میں حلقہ بگوش دونوں میاں بیوی غم آفریں گھڑیوں اور فرحت بخش لمحات میں یوں رشتہ اتحاد میں جڑے رہتے کہ سیر و تفریح بھی ہوتی رہتی۔۔۔ لباس کی آرائش کا اہتمام بھی کیا جاتا اور گھر کا نان نفقہ اور ''گراسری'' کا سلسلہ بھی چلتا رہتا۔ مجید نظامی کا کہنا ہے کہ ریحانہ بیگم کے ساتھ ان کی زندگی بڑی سہولت کے ساتھ گزر رہی ہے۔ نہ لڑائی نہ جھگڑا، ہر مشکل گھڑی کو انہوں نے صبر و تحمل کے ساتھ گزارا، ہر آزمائش میں ثابت قدم رہیں۔ وہ سیاست اور سیاستدانوں کو سمجھتی ہیں، لیکن کبھی ''ان'' کی بحث میں نہیں پڑیں اور کبھی کسی مجلس میں نہیں گئیں۔ وہ کم آمیز اور ''پرفیکٹ'' خاتون خانہ ہیں۔ انہوں نے اپنا پورا وقت اپنی بیٹی رمیزہ کو دیا۔ جب سے رمیزہ لندن میں وہ انہیں بہت مس کرتی ہیں اور روزانہ فون پر بات کرتی ہیں۔ مجید نظامی کی والدہ کے ساتھ ریحانہ بیگم کا بہت کم عرصہ کا ساتھ تھا۔ لیکن ان کی طرح ہی نماز، روزے اور تلاوت قرآن پاک کی پابند ہیں اور مجید نظامی سے زیادہ حج اور عمرے بھی ادا کر چکی ہیں۔ رمیزہ بیٹی بھی ماشاءاللہ اٹھارہ انیس عمرے کر چکی ہیں۔

گُل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے

چھٹا باب

''اچھا ہوا تم آ گئے''......! حمید نظامی کی آخری ہچکی

مجید نظامی اپنے مزاج کے خلاف باتوں پر کبھی بھی صلح جوئی اختیار نہیں کر سکے۔ عموماً ایسے افراد کیلئے ''ضدی'' اور ''انتہا پسند'' ہونے کا الزام آتا ہے۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے شوق کی آگ میں جلتے ہیں۔ دلوں کے وجدان میں سلگتے ہیں۔ اور اپنے اصولوں کے کارزار کو اپنا محور و مرکز قرار دیتے ہیں۔ ورنہ تو ایسے بھی اعتدال پسند ہیں کہ جو آسان راہوں پر چلنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور ''شر'' کی مدافعت کرنے پر بھی تل جاتے ہیں۔

مجید نظامی نے ''بی کام'' چھوڑ کر آرٹس کے مضامین کا اس لیے انتخاب کیا تھا کہ دو اور دو چار کے چکر میں نہیں پڑ سکتے تھے۔ ''بار ایٹ لاء'' کا امتحان جو بھائی کی بیماری کی وجہ سے ادھورا چھوڑا تھا کسی بھی مرحلے دوبارہ جا کر مکمل کر سکتے تھے۔ مگر حمید نظامی کی جواں مرگی کے سانحے کے

بعدوہ کسی اور بات کو اہمیت ہی نہ دے سکے۔ لیکن قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑنے والے مجید نظامی قانون کی عملداری اور قانون کا احترام خوب سمجھتے ہیں۔

حمید نظامی مرحوم کی شدید علالت کی خبر مجید نظامی کو شورش کاشمیری نے دی۔ اس وقت مجید نظامی لندن گریزان لائبریری میں تھے۔ بھائی کی علالت کا سن کر وہ جس حال میں تھے اسی روز، اسی وقت فوراً واپس چلے آئے۔ جونہی وہ لاہور پہنچے بھائی نے آنکھیں کھولیں اور کہا۔ ''اچھا ہوا تم آگئے'' اور اتنا کہہ کر ابدی نیند سو گئے۔ ان پانچ الفاظ میں مجید نظامی پر اعتماد کا سکون بھی شامل تھا۔ مجید نظامی آج بھی اس واقعے کا ذکر کریں تو صاحب عزم و ہمت کی آنکھوں میں آنسو اور آواز میں لرزش تو نہیں آتی لیکن مرحوم بھائی کے الفاظ کا ودیعت کردہ اعتماد درون سینہ غم و اندوہ کی عکاسی ضرور کرتا ہے۔ مجید نظامی جب بھائی کو رخصت کر کے حالات و واقعات کی طرف پلٹے تو معلوم ہوا کہ حمید نظامی سے ان کے بزنس پارٹنر علیحدہ ہو چکے تھے لہٰذا حمید نظامی دوہرے بوجھ کی چکی میں پس رہے تھے۔ ایک ادارہ تن تنہا چلانے کی ذمہ داری اور دوسرا فوجی آمر ایوب خان کی حکومت کے ساتھ حمید نظامی کا مستقل ''اٹ کھڑکا'' تھا۔

آزاد صحافت اور جمہوریت کے قائد حمید نظامی کیلئے ''فوجی حکومت'' ناقابل برداشت تھی۔ اسی دباؤ نے انہیں اتنی اذیت سے دوچار کیا کہ جو ''ہارٹ اٹیک'' کا سبب بن گیا اور جان لیوا ثابت ہوا۔ حمید نظامی مرحوم اپنی زندگی میں ہی مجید نظامی کو ٹیکنیکل ڈائریکٹر مقرر کر چکے تھے۔ جس وقت مجید نظامی نے نوائے وقت کو ''ٹیک اوور'' کیا اس وقت اخبار کے حالات مخدوش تھے۔ ''دلیتھو'' پر چھ صفحوں کا اخبار نکلتا تھا اور اشتہارات بند تھے۔ نیوز پرنٹ ان دنوں درآمد ہوتا تھا اور اخبارات کو حکومت سے ''کوٹہ'' میں ملتا تھا۔ نوائے وقت کا یہ کوٹہ بند تھا اور بلیک مارکیٹ سے خریدنا پڑتا تھا۔ ایسے مشکل حالات میں حمید نظامی مرحوم کے پارٹنر اور نوائے وقت کے منیجنگ ایڈیٹر شیخ خالد محمود مارشل لاء سے ڈر کر علیحدہ ہو چکے تھے۔ حمید نظامی جو کبھی دفتر بھی نہیں گئے تھے انہیں مارشل لاء کے دباؤ کے ساتھ ساتھ اخبار کی مینجمنٹ کا بوجھ بھی اچانک اٹھانا پڑا تھا۔ اتنے دباؤ کا

نتیجہ ظاہر ہے کہ ہارٹ اٹیک کی صورت میں ہی نکلنا تھا۔

مرکزی حکومت کے ساتھ ساتھ صوبائی حکومت بھی انتقامی کارروائیاں کر رہی تھی لیکن مجید نظامی آزردہ خاطر نہ ہوئے اور ایسے کڑے وقت میں ایک لامتناہی جدوجہد کا آغاز کر بیٹھے لیکن رفتہ و گزشتہ کا تجربہ بھی کام آیا۔ مجید نظامی کے طالب علمی کے دور میں نوائے وقت کا دفتر 8۔بیڈن روڈ کی رہائش گاہ کی اوپر والی منزل میں ہوا کرتا تھا۔ مجید نظامی ویکلی نوائے وقت کی کاپیاں جوڑا کرتے، اخبار کے ڈبے بناتے اس پر ''چٹ'' لگا کر پوسٹ کرنے جاتے۔ ڈیلی ہونے پر اشتہار بھی لاتے تھے اور ان کاموں کے علاوہ پی آر او کا شعبہ بھی مجید نظامی نے ہی سنبھالے رکھا۔

گورنمنٹ کالج اور یونیورسٹی کے دور میں جب وہ طالب علم تھے تقریباً چار سال تک یعنی 1950ء سے 1954ء تک ''سرراہے'' بھی لکھتے رہے تھے جس میں شرارت بھرے طنز کے پہلو نکلتے تھے۔ مجید نظامی کا انداز تحریر لوگوں کے دلوں میں گویا مسرتوں کے پھول کھلا دیتا تھا۔

دن بھر کی صعوبتوں میں گھرے ہوئے لوگوں کیلئے اس قسم کی تحریر بارش کی بوچھاڑ کی طرح ہوتی ہے جو ذہنوں کو گرد آلود سوچوں سے بچا کر شادابی اور تازگی عطا کر دیتی ہے۔ مجید نظامی اس لیے بھی سہولت سے ''سرراہے'' لکھ لیا کرتے تھے یہ انداز تحریر ان کے مزاج سے ملاپ رکھتا تھا۔ لیکن اس میں وہ تحریک پاکستان، حالات حاضرہ اور پولیٹیکل صورتحال پر دلچسپ اور کاٹ دار جملے لکھا کرتے تھے۔ ابتدائی ایام میں ''سرراہے'' میں ہی ایک مرتبہ انہوں نے بیگم رعنا لیاقت علی کے ''غرارے'' پر دلچسپ پیرائے میں طنز کیا۔ لیاقت علی خان جو پہلے ہی نوائے وقت سے ناراض رہتے تھے اور برہم ہو گئے اور مجید نظامی کی اس تحریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

''سرراہے'' کی ابتداء حمید نظامی مرحوم نے کی تھی بعد میں وقار انبالوی سمیت بہت سارے لوگ لکھتے رہے۔ آج کل یہ کالم اسرار بخاری لکھ رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں۔ مجید نظامی کے وجود میں چھپے ہوئے کھلنڈرے بچے کا دل چاہتا ہے کہ وہ سرراہے گاہے گاہے لکھنا

شروع کر دیں لیکن معروفیات انہیں یہ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتیں پھر بھی مجید نظامی اسرار بخاری کو بریف کرتے اور ''ٹپس'' بھی دیتے رہتے ہیں جو سرار ہے کی تحریر میں ''بیوٹی ٹپس'' کی طرح خوبصورت ہوتی ہیں۔ ''نوائے وقت'' اور ''نیشن'' کی ادارتی بریفنگ میٹنگ بھی وہ روزانہ تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں ''شروع شروع یعنی 62ء میں نوائے وقت کے اداریہ نویس بشیر احمد ارشد مرحوم تھے جب اداریہ میرے پاس آتا تو وہ بریفنگ کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا میں وہ اداریہ پھاڑ کر ادب کے ساتھ ان کو واپس کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح کے چند واقعات کے بعد انہوں نے ہمیشہ بریفنگ کے مطابق اداریہ لکھا۔ کافی عرصہ تک ہفتہ میں ایک بار یا کبھی کبھی میں خود بھی لکھتا رہا لیکن اب صرف بریفنگ دیتا ہوں یا ''لکھواتا'' ہوں اور لازمی طور پر پڑھ کر پہلے ''کاتب'' کو اور اب ''کمپیوٹر'' کو بھجواتا ہوں۔ اخبار کے اہم مضامین اور کالم خود کلیئر کرتا ہوں۔ اہم اور نازک خبریں بھی خود کلیئر کرتا ہوں اور صبح چھ سات بجے سے رات دس ساڑھے دس تک ''ڈیوٹی'' پر رہتا ہوں لیکن دوپہر کو قیلولہ ضرور کرتا ہوں۔

ساتواں باب

''بنیادی'' اور ''اصلی'' جمہوریت کا ڈھونگ

حمید نظامی کی اچانک رحلت کے سانحے کے بعد مجید نظامی لندن واپس نہ جا سکے حتیٰ کہ ان کی بیگم کو بحری جہاز کے ذریعے گھر کے ساز و سامان کے ساتھ اکیلے ہی واپس آنا پڑا یوں ریحانہ بیگم نے لندن جانے کا بھی سفر تنہا کیا تھا اور شومئی اتفاق کہ واپسی کا سفر بھی تن تنہا طے کرنا پڑا۔ مجید نظامی بحری جہاز سے لندن گئے اور ہوائی جہاز سے واپس آئے انکی بیگم ہوائی جہاز سے لندن گئیں لیکن بحری جہاز سے واپس آنا پڑا.................. ''عجیب اتفاقات ہیں زندگانی کے''۔

نوائے وقت کے اس آڑے وقت میں مجید نظامی کے کام آنے والی نعمتوں میں اچھی اور صابر رفیق حیات کے ساتھ ساتھ ان کی بی کام کی نامکمل پڑھائی، بار کی طالب علمی کے دور کی قانون سے واقفیت، ایم اے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹر، انٹرنیشنل افیئرز کی لندن کی ڈگری کے

علاوہ زمانہ طالب علمی میں نوائے وقت کیلئے کام کرنے کا تجربہ بھی شامل تھا اور یوں ناسا عد حالات میں بھی سادہ طرز حیات کی وجہ سے وہ کامیابیاں حاصل کرتے چلے گئے۔ مجید نظامی اپنے مقصد کے سوا ہر چیز کو ارزاں اور بلند منزل کے حصول کے سوا ہر چیز کو حقیر سمجھتے رہے۔

مجید نظامی ایوب کے دور حکومت کے ذکر پر افسردہ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ ''ڈیموکریسی'' کے حامی ہیں لیکن ایوب خان کی ''بیسک ڈیموکریسی'' کو نہیں مانتے تھے جیسے آج کل ''جمہوریت'' اور ''اصلی جمہوریت'' کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مجید نظامی کا خیال تھا کہ جمہوریت جمہوریت ہوتی ہے نہ ''بنیادی'' اور نہ ''اصلی'' کے ڈھکوسلے۔ یہ ''جمہوریت'' کو توڑنے موڑنے کی نئی نئی اصطلاحیں ہیں۔ مجید نظامی ایوب کے دور کے مارشل لاء کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ کڑا وقت تھا لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کڑا وقت تو اب بھی موجود ہے کیونکہ جو حالات آج کل ہیں کم و بیش یہی حالات اس وقت بھی تھے سوائے اس کے کہ ایوب خان کچھ بہتر آدمی تھا۔ لیکن آج کل پریس اپنی جدوجہد سے کافی حد تک آزادی حاصل کر چکا ہے۔

مجید نظامی کے بارے میں ایوب خان کہتے تھے کہ ''بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ'' مگر ایوب خان کو شاید علم نہیں تھا کہ خوابوں کو حقیقت سمجھنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں وہ ہزار تخت نشینوں اور بادشاہوں سے زیادہ جاہ و جلال اور تمکنت رکھتے ہیں یہ لوگ ہیں جن کے دل درد کی شدت کے باوصف فرشتوں کی طرح پر سکون ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو کانٹوں کا تاج سر پر سجائے پھرتے ہیں۔ یہی لوگ نہ تو دشمنوں اور ظالموں سے خائف ہوتے ہیں اور نہ ہی طاقتوروں کو لبھانے کی کوششوں میں ملوث ہوتے ہیں اسی لیے مجید نظامی نے بڑے بھائی حمید نظامی کی پالیسیوں کو دل سے لگائے رکھا۔ ان دنوں مغربی پاکستان کے گورنر نواب آف کالا باغ امیر محمد خان سے بھی مجید نظامی کی ملاقاتیں رہیں۔ حمید نظامی کی وفات پر جب وہ فاتحہ خوانی کیلئے آئے تو مجید نظامی کو چند دوستوں نے مشورہ دیا کہ امیر محمد خان کو ''شکریہ'' کا فون کرو۔ مجید نظامی نے جواباً کہا کہ انہوں نے مجھ پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنے دوست کی تعزیت پر فاتحہ خوانی کی تھی

لیکن بعد میں مجید نظامی مان گئے اور فون کے بجائے نواب آف کالا باغ سے دلچسپ ملاقات ہوئی۔ نواب آف کالاباغ انگلینڈ کے پڑھے ہوئے تھے۔ مجلس برخاست ہونے سے پہلے بولے۔

You will be less than a man if you do not follow the path or policy of your brother.

چونتیس سالہ جوان ہمت مجید نظامی نے برملا کہا:

Sir I assure you, you won't find me less than a man.... Insha Allah! I will follow the policy of my brother.

نواب آف کالاباغ کے بارے میں یہ بات عام تھی کہ وہ جابر قسم کے انسان ہیں اور غیر جمہوری "فیوڈل" ہیں اور ایوب خان کے معتمد خاص بھی ہیں مگر حیرت انگیز طور پر انہوں نے حمید نظامی کی روش کو سراہا اس کے بعد مجید نظامی پر جب بھی کوئی پریشر آتا تو مجید نظامی انہیں کہلوا دیتے "یہ تو آپ ہی کی نصیحت پر عمل ہو رہا ہے"۔

کچھ عرصے کے بعد جب انہیں "فارغ" کر دیا گیا تو بھی مجید نظامی اور نواب امیر محمد خان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مجید نظامی نے نواب آف کالاباغ کو بہت بااصول شخصیت کے طور پر جانا۔ وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ بھی اصولوں کی پاسداری کا خیال رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے انکی گارڈن ٹاؤن میں واقع نہر والی کوٹھی میں رہتے تھے اور گورنر ہاؤس کا پھیرا بھی کم ہی "مارتے" تھے۔ آج کل کے وزراء کی اولادوں کی طرح انہوں نے اپنے بچوں کو کبھی ناجائز مراعات نہیں دی تھیں۔ نواب امیر محمد خان اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے بارے میں مجید نظامی کو بتاتے تھے کہ میں اعوان ہوں اور یہ علاقہ نیازی پٹھانوں کا ہے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے "شکل صورت" مضبوط رکھنی پڑتی ہے۔ نواب کالاباغ پہلوانی بھی کیا کرتے تھے۔

دنیا کے تمام انسان مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ جسموں کے ترکیبی عناصر بھی ایک جیسے

ہیں مگر ضمیر جدا جدا ہوتے ہیں۔ بہت مختلف ہو کر بھی شباہتیں محسوس ہوا کرتی ہیں۔ مجید نظامی خود بھی اصول پرست آدمی ہیں۔ کراچی میں صدر ایوب خان کے ساتھ شاید پہلی ہی میٹنگ میں مدیران جرائد کو اس طرح بٹھایا گیا جیسے کوئی کلاس روم ہو اس پر فیلڈ مارشل کا انداز گفتگو بھی کچھ ایسا ہی تھا آتے ہی کہنے لگے۔۔۔۔۔۔

آپ حضرات جو کچھ کر رہے ہیں اس پر آپ کو شرم آنی چاہیے

آپ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں

مجید نظامی سب سے کم عمر مدیر تھے انہوں نے کھڑے ہو کر کہا......

اگر جان کی امان ہو تو کچھ عرض کروں؟

ایوب خان نے مسکرا کر کہا

جان کی امان ہے آپ بتایئے؟

مجید نظامی نے کہا......

آپ مجھے بتایئے کہ مجھے کس بات پر شرم آنی چاہیے؟ میں گریبان میں منہ ڈالتا ہوں تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے!

ایوب خان نے جواب دیا

میرا اشارہ آپ کی طرف نہیں تھا آپ بیٹھ جائیں۔۔

اس پر مجید نظامی نے کہا...... پھر آپ کا اشارہ جس کی طرف ہے اس کا نام لیجیے۔ سب کو گریبان میں جھانکنے کا مت کہیے۔

اسی طرح ڈھاکہ میں بھی ایوب خان کے ساتھ مجید نظامی کا معرکہ ہوا اور مجید نظامی کا جواب سن کر بنگالی مدیر تو جیسے ان کے عاشق ہی ہو گئے کہنے لگے ہم تو سمجھتے تھے کہ مغربی پاکستان والے ''جھولی چک'' ہیں مگر اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ بات یوں تھی کہ ایوب خان کو پریس بالخصوص مشرقی پاکستان کے اخبارات سے شدید شکایتیں تھیں۔ انہوں نے ملک بھر سے ڈھاکہ

میں مدیران جرائد کو مدعو کر رکھا تھا جب سب جمع ہو گئے تو ایوب خان تشریف لائے اور آتے ہی فرمانے لگے۔ میں جانتا ہوں اخبار کیا ہے اور اخبار فروشی ایک کاروبار بھی ہے آپ کو اس کا احساس رہنا چاہیے جب وہ بات ختم کر چکے تو مجید نظامی نے کہا:

جناب صدر! ان دنوں آپ کے صاحبزادے بڑے وسیع کاروباروں میں حصہ لے رہے ہیں اور بڑے کامیاب جا رہے ہیں اگر اخبار نکالنا اور اسے چلانا بھی صرف کاروبار ہی ہے تو آپ اپنے صاحبزادے گوہر ایوب سے کہیں وہ ایک اخبار بھی نکال لیں آپ کو اس کاروبار کا پتہ چل جائے گا۔۔۔۔۔۔۔اور ذرا توقف کے بعد مجید نظامی نے کہا یہ "پیشہ پیغمبری ہے"...........

سخن کے اس دلیرانہ انداز میں وہ دل بول رہا تھا جو خوف زدہ ہو کر پسلیوں کے پنجرے میں مقید ہو کر نہیں رہتا بلکہ دھڑکنوں کے ساز پر لہو کی روانیوں میں بیدار رہتا ہے۔ سچ کی عظمت و بزرگی زمین و آسمان کو گھیرے میں لینے کا وصف رکھتی ہے۔ وقت گزرتا گیا لیکن ایوب خان کو نہ جانے کیا سوجھی وہ کہنے لگے۔

مجید نظامی سے کہیں وہ وقت لیکر مجھے آکر ملیں۔

اس وقت اشتہارات، نیوز پرنٹ بند تھے

لیکن جواباً مجید نظامی نے کہا:

مجھے تو ایوب خان سے کوئی کام نہیں ہے، پھر بھی اگر میں ملاقات کیلئے چلا گیا تو ایوب خان کہیں گے کہ آیئے کیسے آنا ہوا؟ تو میں کیا جواب دوں گا۔

محکمہ اطلاعات کے پرانے لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ مجید نظامی نے اس وقت ایوب خان سے ملنا گوارہ نہیں کیا تھا لیکن جب ایوب خان معزول ہو کر بیمار پڑے ہوئے تھے تو ان کی طرف سے پیغام مجید نظامی کے پڑوسی اور کسی حد تک بزرگ دوست اور ایوب خان کے سابق وزیر خارجہ بیرسٹر منظور قادر کی وساطت سے ملا تھا وہ کہنے لگے

آپ کے دوست آپ کو یاد کر رہے ہیں آپ جائیں گے......

تو مجید نظامی نے کہا...... ہاں جاؤں گا کیونکہ ایک تو اب صدر نہیں ہیں اور دوسرا اب وہ بیمار ہیں۔



کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف



آٹھواں باب

الطاف گوہر......وزیر سے زیادہ طاقتور سیکرٹری انفارمیشن

کچھ لوگ محبت اور نفرت دوستی اور دشمنی کے انداز اپنانے میں "پیشہ ور" ہوتے ہیں اور مطالب زندگی کے زیر اثر ان کے احساسات نمو پاتے ہیں۔ مگر چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی محبتوں اور نفرتوں کے پیمانے آنے والے زمانے کے بھیدوں سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو خواب فراموش نہیں ہوتے اور جو یہ سوال کرتے ہیں کہ تو نے کمزوروں پر اپنا مطلق اقتدار کیوں قائم رکھا ہوا تھا...... کیا تیری قوت اور دوام میں ان غریب لوگوں کی شرکت شامل نہیں تھی......

مجید نظامی اسلام آباد میں ایوب خان کے نئے بنگلے میں ان کے سامنے بیٹھ کر یہ سوچ

رہے تھے کہ اس شخص نے اگر صرف ملک وملت کی بہتری کیلئے فیصلے کئے ہوتے تو آج اس بزرگ شخصیت کی آنکھوں میں وحشت کی بجائے روشنی اور پشیمانی اور لکیروں کے جال کی بجائے نور کا وہ ہالہ ہوتا جو بالمقابل کو بھی اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت رکھتا۔ لیکن یہ ملاقات عقیدت ومحبت کے جذبات کی بجائے ''ہمدردی'' کے جذبات سے معمور تھی...... ایوب خان ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس انہیں برآمدے تک لینے آئے۔ بات چیت شروع ہوئی تو ایوب خان کہنے لگے...... اب تو آپ خوش ہیں...... آپ کو آپ کی پسند کی جمہوریت مل گئی ہے۔ مجید نظامی نے جواب دیا...... آپ نے اپنی پسند کا یحییٰ خان دے دیا ہے اگر آپ ''جمہوریت'' کا تحفہ دیتے تو شکریہ ادا کرنے میں خود چلا آتا۔ اس وقت ایوب خان اپنی کچھ ''کوتاہیوں'' کا اعتراف بھی کر رہے تھے۔ کہنے لگے بسم اللہ ہی غلط ہوئی ہے۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مجید نظامی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ یہ اعتراف کوئی بھی صدر کرسی پر بیٹھ کر نہیں کرتا۔ صدر ایوب گپ شپ کے دوران بار بار کہتے رہے...... ''یہ آف دی ریکارڈ ہے'' سچ ہے کہ بلند اور کڑیل انسانوں کو بھی کمزور فطرت کی تند ہوائیں خواہشوں کے اتھاہ سمندر کی طرف پھینک دیتی ہیں...... اور انسان ''رفعت'' کی بجائے ''ذلت'' بھی قبول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

جس گھر میں مجید نظامی ایوب خان سے ملنے گئے تھے۔ اب اسے ''ہاشوانی سیٹھ'' نے خرید لیا ہے۔ مجید نظامی کو اس بات کا افسوس ہے کہ ایوب خان نے ہی پاکستان کو خوبصورت دارالحکومت اسلام آباد تخلیق کر کے دیا تھا۔ لہٰذا اسے اتنا کریڈٹ تو ملنا چاہئے تھا کہ اس کا گھر سرکاری سطح پر خرید کر ''یادگار'' بنایا جاتا۔ اس کے خاندان نے تو وہ گھر بیچ ہی دیا یوں بھی کسی شخص کی اصل دولت سونا چاندی کے انبار نہیں ہو سکتے بلکہ راست کردار کی بدولت چھوڑی ہوئی دانشمندی ہی وہ ورثہ ہو سکتی ہے کہ جس پر قوم فخر کرتی ہے...... کسی ڈکٹیٹر سے کوئی سمجھوتہ نہ کرنیوالے عظیم لوگ دولت اور اقتدار کے قصوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے۔ جبر اور استحصالی قوتوں کے ہتھکنڈوں کے خلاف اعلانیہ نفرت کا اظہار کرنے کی وجہ سے ان پر زندگی تنگ بھی کی جاتی ہے۔ مگر مصائب

ان کی چشم بصیرت کو "وا" کرتے ہیں اور غم انہیں "دلوں" کی زبان سکھانے کا ہنر عطا کرتے ہیں، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وطن پرستی اور ہم وطنوں کے دکھوں کا مداوا ہی اقتدار میں آنے والوں کا مقصد ہونا چاہئے۔ اپنے خوابوں اور خواہشوں کی آواز پر خود محتسب بن کر بیٹھنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی...... حمید نظامی نے جو ورثہ چھوڑا مجید نظامی نے اس ورثے کی حفاظت کے لئے دن رات کام کیا، کیونکہ اس ورثے میں روپے پیسے، بنک بیلنس کی بجائے بطور مدیر و ناشر بے انتہا مشکلات کے ساتھ ساتھ حسین و جمیل افکار، کثیر التعداد کتابیں، ظلمت کے اندھیروں کے خلاف اٹھنے والی آوازیں اور روح کی تشفی کا اہتمام کرنے والے راستوں کی روشنی بھی شامل حال تھی ...... وہ مشکلات جو شفق کی گہری سرخی کے الم میں بھی دل فگار نہیں ہونے دیتیں اور کسی آسمان کو خندہ زن ہونے کا موقع بھی فراہم نہیں کرتیں۔ اطمینان قلبی کی دولت وقت کی انگلیوں سے فضا میں منتشر نہیں ہو سکتیں ورنہ ورثہ محلات کی ہوا میں سانس لیتا ہو تو ریت بن کر بکھر جاتا ہے۔ ظاہری سطح پر سونے کے پانی کی چمک کو روشنی کی ایک شعاع بھی فنا کر سکتی ہے۔

مجید نظامی نے بھی مشکلات کے ساتھ ساتھ نوائے وقت کے چار شہروں سے ایڈیشن جاری کئے۔ حمید نظامی نے ایک انگریزی اخبار کا خواب دیکھا تھا مجید نظامی نے اس کی تعبیر پیش کر دی اب نیشن کے تین شہروں سے ایڈیشن ہیں ہفت روزہ فیملی ہے ہفت روزہ ندائے ملت ہے۔ بچوں کیلئے ماہنامہ پھول ہے۔ چاروں شہروں میں اپنے ماڈرن پریس اور ماڈرن اخباری دفاتر ہیں۔ نوائے وقت کثیر الاشاعتی قومی پالیسی کا حامل ادارہ ہے، جو قائدؒ اور اقبالؒ کے افکار کا حامل ہے۔ پاکستان کو ایک اسلامی جمہوری کے ساتھ ساتھ اسلامی شعور کی فلاحی مملکت دیکھنا چاہتا ہے۔ نوائے وقت اقبالؒ اور قائدؒ کے خوابوں کی حقیقی تعبیر ہے۔ ایوب خان کے دور کا ہی ایک واقعہ سناتے ہوئے مجید نظامی کہتے ہیں کہ ایوب خان کے دور میں وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین اور ان کے سیکرٹری الطاف گوہر کے ساتھ ایک دن "یار" لوگوں نے مجید نظامی کو کھانے کی میز پر بٹھا دیا۔ گوہر صاحب کہنے لگے۔

دیکھئے صحافی ہوتے ہوئے بھی آپ سیاست میں دلچسپی لے رہے ہیں، یہ تو کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

مجید نظامی کہنے لگے:

گوہر صاحب (جو اسلامیہ کالج میں ایف اے میں ان کے ہسٹری کے استاد بھی رہے تھے) نوائے وقت ایک سیاسی پرچہ ہے یہ کوئی فلمی پرچہ تو ہے نہیں ......تو پھر سیاست پر نہ لکھوں تو کس موضوع پر لکھوں ...... یہ اخبار تحریک پاکستان کے لئے تھا اور تحریک پاکستان کے لئے ہی رہے گا اور ہمیشہ ''نظریہ پاکستان'' کا تحفظ کرتا رہے گا۔ اس اخبار کا تو پہلا شمارہ ہی 23 مارچ 1940ء کو منظر عام پر آیا تھا مگر افسوس ان لوگوں پر ہے جو افسر ہو کر سیاست کر رہے ہیں!

دراصل الطاف گوہر وہ طاقتور سیکرٹری انفارمیشن تھا جو ''وزیر'' بھی اپنی مرضی کا لاتا تھا ورنہ عموماً ''وزیر'' اپنی مرضی کا ''سیکرٹری'' لایا کرتے ہیں۔ ایوب خان کا دور شروع سے آخر تک "Confrontation" کا دور تھا، لیکن مجید نظامی کے دل نے فیصلہ کئے رکھا کہ سچائی کے اس راستے پر گامزن رہیں کہ جس سے وہ پرخطر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ سکتے ہیں۔ بونوں میں رہ کر خود کو قد آور سمجھنے کو حماقت جانا، لہٰذا وہ ناتواں قوم پر طاقتور بن کر مسلط ہونیوالوں سے حقارت کا اظہار کرتے رہے۔ مجید نظامی نے اپنی روح کی آواز کو خاموشی کے عالم میں اپنے سینے میں ضبط رکھنے کی بجائے گویائی عطا کی...... اور کسی آمر کی طاقت کی اطاعت کو شیوہ بنانے کی بجائے ان کے خلاف علم بغاوت بلند رکھا۔ حالانکہ سوائے ایک تنہا دل کے ان کے پاس کچھ نہیں تھا جو اندھیروں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھ کر درد و کرب سے کراہ بھی رہا تھا اور روشنی کا آرزومند بھی تھا جو دھڑکنوں کے ساز پر مجید نظامی سے ہر پل یہ کہتا رہا کہ سیاہ رات کے سفر میں یہ راستہ اگر نوکیلے پتھروں سے بھرا پڑا ہے تو کوئی بات نہیں ...... ابھی سورج طلوع ہو گا...... صبح ہوا ہی چاہتی ہے...... لہٰذا مجید نظامی نہ جھکے نہ رکے۔ بقول اقبالؒ

کمال جوش جنوں میں رہا میں گرم طواف
خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف
یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے
کہ یک زبان ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

نواں باب

"Mysterious" اموات

کسی بھی دور کے آمر کی خود پسندی کی کوئی حد نہیں ہوتی حالانکہ اس کی فتنہ سامانی ہلچل مچائے رکھتی ہے......لوگ قرار کے لمحہ کو ترستے ہیں۔ عافیت کا لفظ عنقا اور بے معنی دکھائی دیتا ہے صرف خوشامدی ٹولہ اس کا والہ وشیدا ہوتا ہے اور اس کی ہر خواہش کے سامنے دست بستہ تیار رہتا ہے۔ ایوب خان کے دور میں منعقد ہونے والے انتخابات کے بارے میں مجید نظامی کہتے ہیں ......ایوب خان نے حلقہ انتخاب کی کھیتی میں اپنی مرضی کا بیج ''بی۔ڈی'' کا بویا تھا اسی وجہ سے قائدؒ کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناحؒ جیت کر بھی ہار گئیں تھیں ...... مجید نظامی ظلمت کی پرچھائیوں میں جھانکتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہتے ہیں...... کتنے افسوس کی بات ہے کہ ''قائدؒ'' کی بہن کو شکست ہوئی۔ ان کی شخصیت کا یہی ہالہ ہے جو ماضی کے دھندلکوں کو مستقبل کی روشنی کے ساتھ ہم آہنگ

کرتا ہے............

1965ء کے انتخابات میں فیلڈ مارشل ایوب خان کے مقابلے میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کی حمایت کوئی آسان بات نہیں تھی۔اس بھاری پتھر کو اس وقت کے متحدہ پاکستان کے بڑے بڑے جغادری سیاست دانوں سمیت بعض اہل صحافت نے بھی اٹھانے سے گریز کیا تھا۔ ایسے کڑے وقت میں مجید نظامی نے کھلے بندوں ایوبی آمریت کے ایوانوں کو لرزہ براندام کر کے رکھ دیا تھا۔ایوب خان نے رزق کی مار مارنے کے لئے نوائے وقت کے اشتہارات قطعی بند کر دیئے تھے، پرمٹ اور نیوز پرنٹ بھی بند تھا جو ان دنوں ''سرکار'' کوٹے کے ذریعے دیا کرتی تھی۔ مگر مجید نظامی نے مادر ملت فاطمہ جناح کی حمایت میں مشرقی پاکستان میں نکالنے جانے والے جلوسوں، جلسوں، طلباء اور سیاسی کارکنوں پر تشدد، گرفتاریوں، اشک آور گیس کے استعمال، لاٹھی چارج اور ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے اپوزیشن کی حمایت کی پاداش میں اخراج، تعلیمی اداروں، پولیس کے داخلے، سیاسی کارکنوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک اور حزب اختلاف کی جماعتوں پر چھاپوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔امر واقع ہے کہ فیلڈ مارشل ایوب خان مجید نظامی کے حریت پسندانہ نظریات سے اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ نوائے وقت کے ایک رپورٹر سے تعارف کے بعد لاہور ائیر پورٹ پر کہنے لگے

نوائے وقت والو! تم بھی انسان بنو............

''آزمائش'' کی کسوٹی پر پورا اترنے والے مجید نظامی کی ٹیم کے افراد بھی جانتے ہیں کہ انسان کی قدر و قیمت کا پیمانہ کیا ہے۔خدائے بزرگ بھی انسان کی روح کو تول کر اس کے ہلکے یا بھاری ہونے کا اندازہ کریں گے۔لہٰذا اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے سودے بازی کر کے اپنی پاکیزگی کو آلودہ نہیں کیا جا سکتا۔محکوم افراد کی طرح زندہ رہنا اور مسموم فضاؤں میں سانس لینا ایسے ہی لوگوں کے لئے دشوار ہو جایا کرتا ہے۔

مجید نظامی سعادت و خوش بختی کا لباس پہنے ہوئے ان روشن دنوں کو یاد کرتے ہیں کہ

جب ان کی مادر ملت سے ملاقاتیں ہوئیں تھیں ...... مادر ملت وہ شخصیت تھیں کہ لوگ انہیں بغیر ملاقات کئے بھی جانتے تھے۔ ان کی تصویر چاندی کے صندوقچوں میں رکھی ہوئی ہوتی تھی...... کھیتوں کی ہریالی سے لیکر شہر کی گلیوں تک ان کی سرمدی آواز کی گنگناہٹ سنی جاتی تھی۔ ان کی اجلی شخصیت اور پاکیزہ خدوخال کے نقوش لوگوں کے سرہانے کی دیواروں پر آئینے کی طرح آویزاں تھے۔ اس آئینے میں انہیں قائداعظمؒ کی شبیہہ دکھائی دیتی تھی مگر فاختہ کی طرح پرخلوص اور شفیق مادر ملت سانپ کی طرح عیار اور مکار دشمن کا مقابلہ کیسے کرتیں...... ٹوٹے ہوئے دل کو کون جوڑتا...... نگاہ رعونت تو بے چارگی کا مذاق اڑا سکتی تھی...... صیاد تو صید کو بے بال و پر اور اسیر قفس کر کے خوش رہ سکتا تھا...... لہٰذا رات نے اپنا دور مکمل کیا۔

مجید نظامی جن دنوں یونیورسٹی میں ایم اے پولیٹیکل سائنس کے طالب علم تھے، ان دنوں طلباء کی سرگرمیوں کے انعقاد کے لئے سٹوڈنٹس ''یونینز'' اور ''سوسائٹیز'' ہوا کرتی تھیں۔ مجید نظامی پولیٹیکل سائنس سوسائٹی کے سیکرٹری تھے۔ سوسائٹی کے چیئرمین اسلم سکھیرا تھے جو بعد میں پی سی ایس، ڈپٹی کمشنر اور کمشنر رہے۔ ڈیپارٹمنٹ نے فیصلہ کیا کہ محترمہ فاطمہ جناحؒ کو لیکچر دینے کے لئے بلایا جائے۔ سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے محترمہ فاطمہ جناحؒ کو مدعو کرنے کی ذمہ داری مجید نظامی کے حصے میں آئی۔ مجید نظامی کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی سندیسہ انہیں سبز پوشاک پہنا کر گزر گیا ہے۔ بداطوار، بوالہوس اور ظالم افراد کی قوتوں کے سامنے کھڑے ہو جانے والوں کے لئے ''سچ'' کی روشنی کے روبرو آنا کسی اعزاز سے کم تو نہیں ہوتا...... اس وقت محترمہ فاطمہ جناحؒ لاہور میں گورنر عبدالرب نشتر کی مہمان تھیں۔ مجید نظامی سے وہ بڑی شفقت سے ملیں لیکن اس وقت سیاسی حالات بیگم رعنا لیاقت علی کے حوالے سے کچھ ٹھیک نہیں تھے، لہٰذا وہ شعبہ سیاسیات میں آ کر گفتگو کے لئے آمادہ نہ ہو سکیں اور پیار کے ساتھ معذرت کر دی۔

مجید نظامی کی محترمہ فاطمہ جناحؒ سے المنظر لاہور میں کئی بار ملاقات ہوئی۔ یہ کوٹھی میاں بشیر احمد مرحوم کی تھی لارنس کے گیٹ کے بالکل سامنے، اب بک چکی ہے۔ لیکن ان سے اصلی

ملاقات ان دنوں ہوئی جن دنوں انہیں الیکشن میں دھاندلی کی وجہ سے شکست ہو چکی تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح دراصل ہوا کے جھونکوں میں لرزنے والا تنہا چراغ تھیں جو بہت دیر ٹمٹماتا رہا مگر پھر ہوا کے زعم سے دل برداشت ہو کر افسردگیوں کے حصار میں گم ہو گیا۔

مجید نظامی کی محترمہ فاطمہ جناحؒ سے یہ ملاقات بیگم میاں بشیر احمد جو گیتی آراء بشیر کہلاتی تھیں ان کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی۔ میاں بشیر احمد جنہوں نے مشہور نغمہ بھی لکھا تھا جس کے بول تھے۔

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ

ان دنوں میاں بشیر احمد کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ مگر ان کے صاحبزادے منظر بشیر حیات تھے۔ گیتی آراء بیگم شاہنواز کی چھوٹی ہمشیرہ تھیں آج ہم فردائے درخشاں کے دھندلے مناظر میں سے قوم کی عظمت ماضی کو دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سطح آب پر ستارہ سحری رقصاں تھے۔ تحریک پاکستان میں مسلم خواتین نے بھی انتہائی جوش وخروش اور جذبہ صادق سے حصہ لیا تھا اور اپنی غیر معمولی کارناموں کی بدولت پاکستان کی تاریخ کا باب روشن کرنے میں اپنا حصہ ڈالا تھا، گیتی آراَ نے بھی تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا اور ان کے صاحبزادے منظر بشیر نے بھی!

''المنظر'' کا گیٹ اُس وقت باغ جناح کے بالمقابل تھا۔ اب وہاں کمرشل دفاتر بن چکے ہیں۔ ماضی کی یادیں دھندلا چکی ہیں...... مستقبل کے جدید شہروں کی تعمیر میں ماضی کے شہر مسمار ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر انسان زمانہ حال کے غلطاں و پیچاں کے افکار سے کچھ دیر آزاد ہو کر چند لمحے گزرے ہوئے وقت کے سنہری دامن میں جھانک کر یادوں کے جزیرے میں پہنچ جاتا ہے...... محترمہ فاطمہ جناح نے اس ملاقات میں مجید نظامی کو ان کی بلاخوف وخطر حمایت کرنے پر شکریہ ادا کیا اور یہ بھی کہا کہ کراچی آنا ہو تو ان کی طرف ضرور آئیں۔ لہٰذا کچھ عرصے کے بعد مجید نظامی کو جب کراچی جانا ہوا تو انہوں نے مادرملت کو اپنی آمد کی اطلاع دی...... محترمہ فاطمہ جناح نے جواباً بڑی شفقت سے انہیں صبح کے ناشتے پر آنے کی پرخلوص دعوت دے ڈالی۔ وہ عظیم خاتون

جواپنے ہرانداز اور ہرعمل میں بھائی کی تصویر بن کر رہ گئیں تھیں جو گفتار و کردار میں قائداعظمؒ کا عکس تھیں، شکل وصورت سے بھی بھائی سے مشابہ تھیں اور حرکات وسکنات، تمکنت اور جاہ وجلال میں بھی کوئی فرق نہ تھا۔ ایسی شخصیت جو خود خاتون پاکستان تھیں ان سے ہمکلام ہونے والوں کو یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ وہ قائداعظمؒ سے بھی گفتگو کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

فاطمہ جناحؒ وہ شخصیت تھیں کہ جس کی ہمت کو جبر کی قوتیں بھی خمیدہ نہ کر سکی تھیں اور جو شکست کی سازش کے باوجود "مینار رفعت" پر فائز رہیں...... ایسی شخصیت کے سامنے گویائی کو اذن دینا دشوار ہوتا ہے مگر ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے سرگرداں لوگ دانش وحکمت کی رسائی سے دور نہیں ہوتے۔ مجید نظامی کی آنکھیں عزم وہمت کے چراغوں سے روشن تھیں اور قدم ارادوں کی پختگی کے ساتھ مستحکم تھے لہٰذا صبح ساڑھے سات آٹھ بجے مجید نظامی محترمہ فاطمہ جناحؒ کی رہائش گاہ "قصر فاطمہ" پہنچ چکے تھے...... استقبالیہ سے محترمہ کو اطلاع دی گئی کہ مجید نظامی ملاقات کے لئے قصر فاطمہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ اوپر والی منزل پر تھیں۔ انہوں نے اوپر سے چابی پھینکی تو دروازہ کھول کر مجید نظامی کو اندر جانے دیا گیا۔ مجید نظامی کہتے ہیں کہ غالباً یہ محترمہ کی روٹین تھی۔ کیونکہ معلوم نہیں کہ گارڈ بھی قابل اعتبار تھا کہ نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ایک تالہ اندر سے بھی لگاتی ہوں...... محترمہ فاطمہ جناحؒ کو کیا خبر تھی کہ بھائی کے افکار وخیالات کی پیروی کرنے پر یوں تمام رشتے بیگانے ہو جائیں گے اور دنیا ان کے لئے جہنم زار بنادی جائے گی۔

مگر "خاتون پاکستان" گوناں گوں اوصاف کی حامل خاتون تھیں۔ سخن دلنواز اور جاں پرسوز سے ان کی شخصیت عبارت تھی، بڑھاپے میں بھی وہ جفاکش اور باہمت خاتون تھیں۔ آخری عمر میں انہوں نے انتخابی مہم کے لئے جو دورے کئے وہ ان کی جانفشانی کے شاہد ہیں۔ قائداعظمؒ کی طرح وہ کارکنوں اور طالب علموں سے محبت اور شفقت سے پیش آتی تھیں۔ مجید نظامی کے ساتھ انتخابی مہم اور حالات حاضرہ پر دیر تک گفتگو کرتی رہیں۔ مجید نظامی کی محترمہ فاطمہ جناحؒ سے یہ آخری ملاقات تھی۔ تھکی تھکی آنکھیں، دہر کی آلائشوں سے دلبرداشتہ تھیں۔ محترمہ کا دل حالات

کی سنگینی پر افسردہ اور پاش پاش تھا...... کچھ عرصے کے بعد محترمہ فاطمہ جناح شب سیاہ میں کسی ڈوبتے ستارے کی طرح سطح آسمان پر ہمیشہ کے لئے پوشیدہ کر دی گئیں .... اور ہر ذرہ کائنات خاموش رہا......

مجید نظامی کہتے ہیں کہ ہماری تاریخ کے اوراق پر ایسی اموات سوالیہ نشان کی طرح موجود ہیں ...... ایسی اموات کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون کس طرح موت کے تاریک راستوں کا حصہ بن گیا۔ پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم سید حسین شہید سہروردی بیروت میں مارے گئے۔ پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان راولپنڈی کے جلسے میں مارے گئے اور ان کے قاتل سید اکبر کو پولیس کے پہرے میں مار دیا گیا۔ بانی پاکستان قائداعظمؒ گورنر جنرل کی حیثیت سے شدید علالت کے باعث کوئٹہ سے کراچی آ رہے تھے تو وزیراعظم لیاقت علی خان انہیں ''ریسیو'' کرنے نہیں آئے، جو ایمبولینس ان کے لئے بھیجی گئی تھی ائیر کنڈیشنر کے بغیر تھی اور اس کا انجن راستے میں فیل ہو گیا وہ سڑک کے کنارے کھڑی رہ گئی۔ اسی طرح ضیاء الحق ہوا میں مارے گئے، جس ''حادثہ'' میں امریکہ کا سفیر بھی مارا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی۔

ضیاء الحق کیس میں جنرل اسلم بیگ زندہ ہیں مگر وہ روشنی نہیں ڈالتے ...... لہٰذا اس قسم کی اموات پس پردہ اندھیروں میں چلی جاتی ہیں ...... مادر ملت کو کس نے مارا یہ ابھی تک راز ہی ہے لیکن گزشتہ روز ایک پیر پختہ کار پیرزادہ شریف الدین صاحب کا بیان نظر سے گزرا کہ محترمہ کو ان کے پشتو سپیکنگ ملازم نے ڈنڈوں سے مارا تھا۔

فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

دسواں باب

جب ہندوستان نے چالاکی دکھائی

حریت پسند وہ ہوتا ہے جو ہر ظلم و استبداد کا جرات کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ جہاں کہیں شر کی فصل کو دیکھتا ہے اسے اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے جہاں کہیں مکروہ پھوڑا دکھائی دے اسے نشتر لگاتا ہے۔ جہاں ریاکاری کو دیکھے اسے مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وطن کی فضاؤں کی محبت میں گرجنے والے مجید نظامی بھی ایسے ہی حریت پسند ہیں مگر ان کا دل دراصل چشمۂ محبت ہے۔ ایوب خان کی آمریت سے نفرت کے باوجود اس کی کچھ باتوں کو وہ سراہتے ہیں۔ ایک تو وہ اس دور کی خارجہ پالیسی کے خلاف نہیں ہیں اور ''امریکہ'' کی طرف اس وقت کے ''جھکاؤ'' کی پالیسی کو درست مانتے ہیں......اور کہتے ہیں ہماری لڑائی دراصل ''بھارت'' کے ساتھ ہے کیونکہ پارٹیشن کے وقت سے ہی اسلحہ بھارت کے حصے میں بہت زیادہ ہی نہیں بلکہ مونٹ بیٹن کی

بدمعاشی کی وجہ سے سارے کا سارا ہی چلا گیا تھا اور ہمارے حصے میں کم آیا تھا۔ مونٹ بیٹن قائداعظمؒ سے ناراض تھا کہ انہوں نے اسے بھارت کے ساتھ ساتھ پاکستان کا بھی گورنر جنرل کیوں نہیں بنایا جو اس کی دلی خواہش تھی۔ طاقت کی غیر متوازی تقسیم نے بھارت کو مضبوط کر دیا۔ پھر وہ روس کا رفیق بن گیا جبکہ پاکستان اتنا مضبوط نہیں تھا۔ لہٰذا ملکی دفاع کے پیش نظر اس وقت امریکہ کی طرف جھکاؤ کی پالیسی درست تھی مگر ایوب خان نے جلد ہی امریکی فریب کے جال میں گرفتاری کو قومی ناموس کی بقاء کی جدوجہد پر ترجیح دینا شروع کر دی تھی۔ امریکی وزارت خارجہ کے ایک ترجمان ''تھامس پکرنگ'' نے جارج یونیورسٹی کی ایک تقریب میں پاکستان کے متعلق امریکی ایجنڈے کی نقاب کشائی کرتے وقت کہا تھا کہ ''بھارت ہی وہ انجن ہے کہ جس کے زور پر جنوبی ایشیا سرگرم سفر ہے'' مگر مشکل یہ ہے کہ پاکستان کے عوام ''بھارتی انجن'' کی ''بوگی'' بننے پر قطعی آمادہ نہیں ہیں جبکہ امریکی مفادات کا تقاضا ہے کہ پاکستان برصغیر میں بھارت کی قائدانہ حیثیت کو کھلے دل سے قبول کرے اور ''بھارتی انجن'' کے پیچھے پیچھے ایک معمولی سامان ڈھونے والی ''بوگی'' کی مانند گھسٹتا چلا جائے............ پاکستان بھارت کی بالادستی قبول کرنے کو نہ کل تیار تھا نہ آج ہے۔

مجید نظامی کے خیال میں موجودہ حالات میں امریکی تابعداری پر عمل پیرا ہو کر ''جھکاؤ'' کی پالیسی قومی وقار ''مکاؤ'' کی پالیسی بنتی جا رہی ہے۔ لہٰذا ہمیں امریکی دوستی کو قومی خودمختاری اور نظریاتی انفرادیت پر ترجیح نہیں دینا چاہئے۔ 9/11 کے بعد بش کا امریکہ ''کروسیڈی امریکہ'' بن گیا ہے اور ہر ''کروسیڈ'' ''اسلامی جہادیوں'' کے خلاف ہے۔ افغانستان پر اس کا قبضہ ہے، عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ہے، ایران دھمکیوں کی زد میں ہے اور اب تو چار سو نشانے بھی چن لئے گئے ہیں۔ لبنان پر اسرائیلی حملے کی بش اعلانیہ پشت پناہی کر رہا ہے۔ پاکستان اپنے بکرے یا بکری کی خیر کب تک منائے گا۔ کیونکہ وہ واحد مسلمان مانی ہوئی ایٹمی قوت بھی ہے! امریکہ کو یوں بھی کمزوروں کی بے چارگی پر فتوحات کے ''اہرام'' تعمیر کرنے کا جنون سوار ہے۔ وہ کسی کے نالہ

شیون پر کان دھرنے کو تیار نہیں بلکہ ہٹ دھرمی سے قوموں کی ''فنا'' اور ''بقا'' کی داستان لکھنے کی سعی کر رہا ہے۔ مگر رونے والوں کے آنسو، بیواؤں کی مظلومی اور یتیموں کی یتیمی ''زندگی'' کے دل میں اس طرح ٹپک رہی ہے جس طرح سانپ کے کاٹنے سے زہر انسان کے لہو سے ٹپکتا ہے۔

ایوب خان کے دور کی اچھی باتوں کو سراہتے ہوئے مجید نظامی کہتے ہیں کہ دوسری مرتبہ انڈیا کے خلاف جنگ میں حکومت کی حمایت اپنی حمایت تھی...... درشت لہجے درست باتوں پر لطف و مہربانی کا رویہ اپناتے ہیں کہ سخت اور کھردرے ہاتھ نرم و نازک ہو جائیں۔ مگر یہ نرماہٹ کسی ''قوت'' سے خائف ہو کر نہیں ہوتی بلکہ انصاف پسندی اور سچائی کے اس آفتاب کی وجہ سے روشن رہتی ہے جو بدعنوانیوں کی ظلمت پر غالب آ جاتا ہے۔

انہی دنوں ''پینسٹھ'' کی جنگ قومی جنگ بن کر کوچہ و بازار میں کر پھیل گئی قوم اسلاف کا دیا ہوا وقار اوڑھے پر عظمت دلوں کے ساتھ غاصبوں کو پامال کرنے یکجان ہو گئی۔ لوگوں کے ہاتھوں میں ''وفا'' اور ''انا'' کی تلواریں تھیں جنہوں نے جگر لخت لخت اور دل ریزہ ریزہ نہیں ہونے دیئے۔ بلکہ ان کے ہونٹوں پر دعاؤں کے وہ پھول کھلتے رہے جو انکے غم زدہ قلوب کی نم مٹی سے ہی پھوٹ رہے تھے۔ ایوب خاں نے بھارتی حملے کے جواب میں اعلان جنگ کلمہ طیبہ پڑھ کر کیا تھا۔

سکوت نیم شب اور سکون سحر میں رخنہ انداز ہونیوالی بھارتی فوج کے اس اقدام کو ''اچانک'' رونما ہونے والا واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن مجید نظامی کے خیال میں یہ اتنا ''اچانک'' بھی نہیں تھا بلکہ ہمارے کمانڈو اور جرنیل اتنے ''الرٹ'' نہیں تھے کہ جتنا ہونا چاہئے تھا اور کم و بیش یہی ڈرامہ موجودہ صورتحال میں بھی لکھا جا رہا ہے۔ انڈیا تیاری کرتا چلا جا رہا ہے اور ہم ''جائنٹ ڈیفنس'' کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ حکمران فکر فردا سے غافل ہو چکے ہیں اور تخلیق فردا سے بھی بے نیاز ہیں مگر مجید نظامی جب سینہ ہائے عمیق میں روپوش یادوں کو دیکھتے ہیں...... تو یادیں تلخ حقائق کے طوفان کے ساتھ ابھرتی اور آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتی ہیں...... اور وہ شنیدہ اسرار کی بازگشت سننے لگتے ہیں...... دراصل زندگی ''آزادی'' کے بغیر روح سے خالی جسم کی طرح ہوتی

ہے......اور ''پینسٹھ'' کی جنگ کی وجوہات پاکستان میں آزادی کی روح پھونکی جانے سے بھی پہلے کے ''کشمیر'' کے واقعات سے جڑی ہوئی ہیں......اور کشمیر کی جنگ کا آغاز پاکستان بننے سے پہلے ہی ہو چکا تھا کہ جب قبائل سری نگر تک پہنچ گئے تھے۔ اس وقت کچھ قبائل اگر لوٹ مار نہ کرتے اور ''ائیر پورٹ'' پر قبضہ کر لیتے تو ہندوستان کا کشمیر پر قابض ہونا ناممکن تھا۔ ہندوستان نے ''چالاکی'' کا مظاہرہ کیا اور ائیر پورٹ پر قبضہ کر لیا اور اس ابتدائی قبضے میں ہندوستان کو قوم پرست شیخ عبداللہ کی اعانت حاصل تھی۔

پر فریب باتوں کے محلات بزدل اور مکار لوگ تعمیر کیا کرتے ہیں، جو زمیں بوس ہو کر ہوا میں بکھر جاتے ہیں اور مادر وطن کے سچے سپوت وطن کی خوشنودی کے لئے صبح کے پرندوں کی طرح گیت گاتے ہیں، کبھی ''مور'' کی طرح وجد کا رقص کرتے رہتے ہیں اور کبھی شیر کی طرح دھاڑتے ہیں۔ غداروں اور مکاروں پر رقص و وجد کا عالم کبھی طاری نہیں ہوتا کیونکہ ''نفس'' کا اطمینان اور قوت ایمانی کی سچائی ہی انسان کو ''معرفت'' کی وادیوں تک لے کر جا سکتی ہے۔ ورنہ جسم کے پنجر خشک لکڑیوں اور بوسیدہ عمارتوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔ زندہ روح نقش و نگار بناتی ہے۔ محبتوں اور نفرتوں کی شدت سے بہنے والے آنسو آلودگیوں کو دھو ڈالتے ہیں اور پتھر ایسے دلوں کو نرم و گداز کر دیتے ہیں۔ خوف کی حالتوں میں رہ کر بھی انسان ضعیف و نزار حالت میں زندگی گزار دیتا ہے۔

مگر جو لوگ منافقت کو دین اور جھوٹ کو زندگی بنا کر دھول بن جاتے ہیں تاریخ کے اوراق پر ان کا نام و نشان نہیں رہتا۔ مگر جذبے کی سچائی کو زندگی کی حرارت بنانے والے نور میں تحلیل ہو جاتے ہیں......غلام عباس اس وقت مسلم کانفرنس کے صدر تھے اور جموں میں مقیم تھے جبکہ شیخ عبداللہ اس وقت نیشنل کانگریس کے صدر اور ہیڈ کوارٹر سری نگر میں تھے۔

جموں و کشمیر میں سیاست کا پہلا لاوا 13 جولائی 1931ء کو سری نگر سنٹرل جیل کے سامنے پھوٹا تھا۔ اسی سے آزادی کے انقلاب کی حریت انگیز تحریک نے جنم لیا اور جس نے

ریاست کے بلند و پست کو اپنی لپیٹ میں لے لیا...... اور جس نے ڈوگرہ حکمرانوں کے ایوانوں کو ہلا ڈالا۔ اس تحریک کے ہراول دستے کے سالار شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس تھے۔ 1931ء سے لے کر 1938ء تک دونوں رہنما یک جان دو قالب تھے لیکن بعد میں شیخ عبداللہ کانگریس کی پرفریب سیاست اور اندرا گاندھی و نہرو کی مفاد پرست سیاسی وجاہت سے مسحور ہو گئے۔ جبکہ چودھری غلام عباس غیر فانی شجاعت کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہے اور 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد قائداعظم محمد علی جناح کی دلآویز شخصیت، جرات مند قیادت، دوٹوک سیاست اور مسلمانوں کے نصب العین اور نظریہ پاکستان کے ساتھ اپنا فکری اور عملی ناطہ جوڑے رکھا۔ چودھری غلام عباس نے اپنی محبت کو متحرک سمندر بنائے رکھا اور اسے وہ چشمہ نہیں بننے دیا جو کچھ دور جا کر کسی نشیب میں رک جاتا ہے اور وہیں کی زمین اسے اپنے آپ میں جذب کر کے فنا کر دیتی ہے۔

مجید نظامی گفتگو کے دوران اوراق پارینہ پلٹتے چلے جاتے ہیں اور میں سمندر کے کنارے کھیلتے ہوئے کسی بچے کی طرح لہر در لہر پانی کی طاقت، ساحل کے مدوجزر گیلی ریت پر پاؤں کے نشانات، ہوا کے انداز اور سطح آب پر ابھرتے اور دیکھتے ہی دیکھتے گم ہو جانے والے بڑے بڑے جہازوں کا نظارہ کرتی رہتی۔ عقل وفہم کی کشتیاں اپنی موجوں پر سوار ہو کر آتیں اور عہد ماضی کی موجوں کا دامن عہد موجود کی لہروں کو سونپ دیتیں۔ حیات جاوداں اور حیات تازہ کے درمیان وقت کا طول و اختصار حائل ہوتا رہتا۔ مگر میرے تصورات کی فضائے بسیط میں گفتار کے پرندے اڑتے رہتے اور میرے دل کی گہرائیوں میں گزرے ہوئے وقت کے پانیوں کی لہریں' اپنی ذات کی پہچان کے' وطن کی محبت کے' سچ اور جھوٹ کے فرق کے' انجانے مناظر چھوڑ جاتیں۔

چوہدری غلام عباس غلامی سے منحرف قوم کو منزل تک پہنچانے کی سعی کرنے والے شرافت نفس پر یقین رکھنے والے شریف النفس انسان تھے۔ وہ حریت اور مساوات پر یقین رکھتے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ آزادی کے کھیتوں کو اپنی پیشانی کے پسینے کا پانی دیتے اور مسلمانوں کی

طاقت اور قوت کو تر و تازہ رکھنے کی کوشش کرتے تا کہ وہ جبر کی طاقت کو سلب کر سکیں۔ انہیں شیخ عبداللہ کی نیشنل کانگریس کی سازشوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ جن کی پشت پناہی آل انڈیا کانگریس کر رہی تھی۔

مجید نظامی کہتے ہیں چوہدری غلام عباس کی زندگی کے یہ سترہ سال ایثار و قربانی اور ہمت و لگن کا قابل فخر کارنامہ ہیں کیونکہ یہ دور اتنا کٹھن اور صبر آزما تھا گویا ریگستانوں اور سنگلاخ پہاڑوں کا سفر تھا کہ جس میں کانٹوں کی چبھن، مسافت کی تھکن اور حالات کی اڑچن مسلسل دامن گیر تھی۔ اس میں عزم و حوصلہ ہی زادراہ اور "تائید ایزدی" واحد سہارا تھی......لیکن مومنوں کے لئے یہی سہارا بہت ہوا کرتا ہے۔

مجید نظامی اس دور کے ایک اور تابناک کردار اے آر ساغر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہیں خداداد ذہانت، حاضر دماغی، علم و ادب کے ذوق اور حسن خطابت کی وجہ سے مسلم کانفرنس کا "دماغ" کہا جاتا تھا......ساغر کے دادا "بیچ پہاڑہ" ضلع اسلام آباد کے بٹ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جو کاروبار کے سلسلے میں اسلام آباد کشمیر سے جموں شہر آ گئے تھے۔ 1932ء سے لیکر 1948ء تک جناب اے آر ساغر چودھری غلام عباس کے ہمراہ تھے۔ قوم کو آزادی کی نعمت سے روشناس کرانے میں اور حکومت وقت کے خلاف اپنے ہم وطنوں کو آزادی پر اکسانے میں دونوں قدم بہ قدم ہم قدم رہے......وہ کشمیر کی پہاڑوں پر جنگلی پھولوں میں سورج کی کرنوں کو رقص کرتے دیکھنا چاہتے تھے اور وادیوں میں طیور کو نغمہ سرا چاہتے تھے......جن وادیوں میں سے پرندے بھی گولہ و بارود کی آوازوں سے ڈر کے اڑتے ہوں وہاں انسانوں کی آزادی کا قیام خام دکھائی دینے لگتا ہے......

مجید نظامی نے کشمیر کے بارے میں اس قسم کی دردمندی پر کہا کہ شاعرہ ہونے کی حیثیت سے آپ نے بھی اپنی نثری نظموں پر مشتمل کتاب کا نام شاید اسی لئے "چڑیا ڈر کے اڑتی ہے" رکھا تھا۔

اے آر ساغر طلوع سحر کے خواب کو روپوش ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لہٰذا ''آزادی'' کی تحریک کے اسرار و رموز میں سرگرداں کراچی میں عبداللہ ہارون کے دولت کدے پر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس شملہ میں قائداعظمؒ سے ملاقاتوں کے دوران اور حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے ساتھ ملاقاتوں میں چودھری غلام عباس کے ساتھ ساتھ رہے۔

مجید نظامی نے چودھری غلام عباس کی آخری بیماری کے دوران انہیں لاہور کے میو ہسپتال میں بھی دیکھا اور راولپنڈی میں ان کی رہائش گاہ پر بھی۔ پھر جب وہ آخری سفر پر روانہ ہوئے تو پنڈی میں ان کی نماز جنازہ میں بھی شرکت کی۔ ان کے انکے خاندان کے ساتھ بھی مراسم تھے۔ ان کے ایک بھائی انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر بنے۔ چھوٹے بھائی لاہور کے ریگل چوک میں فلیٹ میں رہتے تھے۔ ان کے بھائی کا ایک بیٹا اسلام آباد کی ایک وزارت میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ چودھری صاحب مرحوم کو اپنی بیٹی کے حوالے سے ایک بہت بڑے صدمے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ جموں کے فسادات میں اس عفت مآب کو ایک غیر مسلم اٹھا کر لے گیا جو بعد میں بصد مشکل اسلام قبول کر کے راولپنڈی آ کر رہائش پذیر ہو گیا۔ کشمیری آج تک اپنی سرزمین کو آزاد خطہ دیکھنے کے لئے ہزاروں عفت مآب بیٹیوں کی قربانیاں دے چکے ہیں لیکن ابھی تک ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے خواب مآب نعرے کی پورے کشمیر کے حوالے سے تعبیر نہیں دیکھ سکے۔ مجید نظامی بھی اس خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں۔

آزادی کا حسین اور پرکیف خواب دیکھنے والوں کے لئے پرخطر راستے بے معنی کھیل تھے۔ آبلہ پا اور بے بال و پر کردینے والا سفر ہر گام شادکامی کا یقین دلاتا تھا۔ لہٰذا تحریک آزادی کی محبت میں سرشار دل چھوٹی چھوٹی ناکامیوں اور رفتہ و گذشتہ کی شورشوں کو بھول جایا کرتے تھے ......لیکن وقت کیساتھ ساتھ یہ شورشیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ آج بھی سوا کروڑ کشمیری آزادی کے مشن کے لئے تاریخ کی سب سے بڑی قربانی دیتے چلے جا رہے ہیں...........اور یہی ''ٹینشن'' بڑھتے بڑھتے ایوب کے دورِ حکومت میں 1965ء کی جنگ کے آغاز کا باعث بنی تھی۔

گیارھواں باب

مجید نظامی ''فاتح'' بن کر گئے

65ء میں جب پاک بھارت جنگ کا آغاز ہوا تو مجید نظامی ان دنوں لاہور میں تھے۔ ہندوستانی فوج واہگہ باٹا پور تک چکر لگا گئی تھی اور لاہور کے زندہ دلان اپنے سرحدی محافظوں سمیت سو رہے تھے۔ جبکہ ہندوستانی یہ سمجھتے رہے تھے کہ لوگ چھپے ہوئے ہیں۔ نہر بی آر بی، ڈیفنس کینال تھی ہندوستانیوں نے وہ کینال بھی بڑی آسانی کے ساتھ عبور کر لی تھی۔ مجید نظامی دوران جنگ آغا شورش کاشمیری کے ساتھ محاذ پر بھی جایا کرتے تھے۔ اس محاذ پر مشرقی بنگال کی رجمنٹ بھی لڑ رہی تھی۔ آغا شورش نے ان کی شان میں مشرقی بنگال کے آتش بجانوں کو سلام! کی ناقابل فراموش نظم لکھی۔ وہ اہل ہمت کے ارادوں کی عظمت و استقامت کو سلام پیش کرنا چاہتے تھے جو قوم کی حفاظت کے شوق و آرزو کی تکمیل کے لئے آسان راہوں کو چھوڑ کر سنسان جنگلوں

میں براجمان تھے اور جن کے جاہ وجلال سے ویرانے بھی آستانے بن چکے تھے۔ مجید نظامی سیالکوٹ کے محاذ پر بھی گئے جہاں جنرل ٹکا خان تھے۔ اسی طرح کھیم کرن کا وہ علاقہ جس پر پاکستان نے قبضہ کرلیا تھا، وہاں بھی گئے اور بھارت کے ایک ''مقبوضہ ٹینک'' پر بیٹھ کر تصاویر بھی بنوائیں۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ جنگ نہ پاکستان نے جیتی اور نہ ہندوستان نے۔ تاشقند میں شاستری اور ایوب کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔ لیکن اس کے باوجود شاستری پتہ نہیں ''شاک'' سے مر گیا یا خوشی سے مر گیا...... اس ''مفتوحہ'' علاقے میں فاتح بن کر جانے کے احساس کو وہ آج تک فراموش نہیں کر سکے۔ بلکہ پاکستانی فوج کی کامرانی کا احساس اب بھی ان کی آنکھوں میں جگمگانے لگتا ہے...... وہ کہتے ہیں یہ ایک قومی جنگ تھی۔ ایک قومی جذبہ تھا جو وطن کی محبت اور حفاظت کے تصور میں ہر دل میں دھڑکتا تھا۔ مجید نظامی بھارت ایسے مکار اور دشمن ہمسایہ کی وجہ سے ایسی مضبوط اور قوی فوج کے حامی ہیں جس کا کام ملک پر حکومت کرنا نہیں، بلکہ سرحدوں کی حفاظت کرنا ہو۔ جو بھارتی سورماؤں کے دانت کھٹے کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہو۔

مجید نظامی نے بتایا کہ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ صدر ایوب نے یہ جنگ ''کلمہ'' پڑھ کر شروع کی تھی کیونکہ یہ ایک قسم کا ''جہاد'' تھا اور اس احساس کی وجہ سے ملک میں کسی جنگی بحران کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ملک میں مہنگائی کا کوئی وجود نہیں تھا بلکہ کھانے پینے کی اشیاء وافر مقدار میں میسر تھیں اور کسی جگہ پر لوٹ مار اور ذخیرہ اندوزی کا کوئی تصور نہیں تھا...... پوری قوم اس جنگ میں شریک تھی۔ لڑاکا جہازوں کی ہوائی جنگ لاہوریے اس شوق سے دیکھتے تھے جیسے وہ کشتیاں اور کبڈی دیکھا کرتے تھے۔

لیکن اب...... وہ ایام کیا ہوئے...... وہ شب ہائے ماضی کہاں گئیں کہ جن کی آغوش میں روز روشن کی صبح کی تابندگی تھی...... کیا وہ آغوش ماضی میں ہی خفتہ ہیں یا عدم کے پردوں میں چھپ گئیں کیونکہ اب تو قوم کو بغیر جنگ کے بھی ''جنگی صورتحال'' کا سامنا ہے۔ مہنگائی، لوٹ مار اور ذخیرہ اندوزی کے رجحانات زہریلی گھاس کی طرح جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لئے مجید

نظامی سمجھتے ہیں کہ تین بنیادی چیزیں ایسی ہیں جو ملک میں قائم ہونی چاہئیں قوم ان سے محروم ہے وہ تین بنیادی چیزیں جمہوریت کی بحالی، اسلامک ویلفیئر سٹیٹ کا قیام اور جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ۔

مجید نظامی سمجھتے ہیں کہ جب تک جاگیرداری نظام کا خاتمہ نہیں ہوتا اس وقت تک ملک سے ''ڈکٹیٹر شپ'' نہیں جا سکتی...... 1958ء کے بعد ایوب خان نے جو ''نام نہاد'' اصلاحات ''لینڈ ریفارمز'' کے نام پر کی تھیں۔ ان کے بارے میں مجید نظامی ممتاز دولتانہ مرحوم کے بارے میں بتاتے ہیں کہ راوی ان کے بھانجے عزیز قریشی ہیں جو موقع کے گواہ ہیں۔ دولتانہ مری میں پریذیڈنٹ ہاؤس کے کم و بیش بالمقابل رہتے تھے۔ ایک دن صدر ایوب کی گاڑیوں کے قافلے کا دولتانہ سے آمنا سامنا ہو گیا، نوجوان عزیز قریشی اپنے ماموں دولتانہ کے ساتھ واک کر رہے تھے۔ ایوب خان دولتانہ کو دیکھ کر گاڑی روک کر اتر گئے تو باتوں باتوں میں دولتانہ صاحب کے آٹھ سو مربعوں کا ذکر آ گیا جو زرعی اصلاحات کی زد میں آ رہے تھے۔ ایوب خان نے مشورہ دیا آپ درخواست دیں ہم کچھ کریں گے۔ لیکن دولتانہ صاحب ہوشیار سیاستدان اور اس وقت سوشلسٹ خیالات کے حامل تھے وہ پہلو بچا گئے لیکن ان کی وجہ سے ''بائیس'' خاندان بن گئے تھے۔ اب شاید وہ ''بائیس ہزار'' بن چکے ہیں۔ لہٰذا ''صنعتی خانوادے'' اور ''زراعتی خانوادے'' کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر عوامی حکومت نہیں آ سکتی......

مگر ایسی خوش بختیوں کا امکان اس وقت معدوم ہو جاتا ہے جب بہار میں خزاں کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ بلبل کے گیتوں میں بھی درد کے لے بڑھ جاتی ہے اور بادل دل گرفتہ ہو کر برستے ہیں...... طمانیت قلبی ریت کے ذروں کی طرح بکھر جاتی ہے...... راحت و سکوں سے محروم مناظر دلوں پر افسردگی طاری کر دیتے ہیں...... تب کچھ انسان اشک شوئی کے لئے نکل پڑتے ہیں ...... یوں ہی انسان کے ہاتھ پاؤں میں تو بیڑیاں ڈال جاتی ہیں مگر فکر کے پرندے کو تو قید نہیں کیا جا سکتا...... وہ تو فضاؤں میں ہوا کی طرح آزاد رہتا ہے۔

مجید نظامی نے بتایا کہ یحییٰ خان کا دور پاکستان کی تاریخ کا ''بدترین'' دور تھا...... یحییٰ خان سے ہونے والی چند ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ تیس مارچ کو ملنے والا ''ستارۂ پاکستان'' لینے نہیں گئے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد یحییٰ خان نے ایڈیٹرز کو راولپنڈی یاد کیا۔ ایڈیٹرز لان میں تشریف فرما تھے۔ یحییٰ خان کے پریس آفیسر قاضی سعید جو پشاور سے تعلق رکھتے تھے مجید نظامی سے کہنے لگے۔

آپ کو صدر یاد کر رہے ہیں......

جب مجید نظامی اندر گئے تو یحییٰ خان نے میز کی دراز کھولی اور ستارہ نکال کر مجید نظامی کے گلے میں ڈال دیا اور بولے......

''بچو! اب تو قابو آ گئے ہو......!

گویا انہیں علم تھا کہ مجید نظامی ''ستارۂ پاکستان'' لینے کے لئے تقریب میں نہیں آئے تھے۔ دوسری مرتبہ ایک بریفنگ کے دوران جہاں مولانا کوثر نیازی مرحوم بھی موجود تھے جب مجلس اختتام کے قریب ہوئی تو کوثر نیازی یحییٰ خان سے کہنے لگے۔

جناب صدر! ایک گزارش ہے کہ لاہور کے بعض اخبارات کے خلاف مقدمات ہیں وہ واپس لے لیں۔ ان میں نوائے وقت بھی شامل تھا۔

تو یحییٰ خان کہنے لگے۔

''یہ معافی مانگ لیں ہم مقدمات واپس لے لیں گے''

کوثر نیازی کہنے لگے۔

ہال میں خاموشی ہے آپ سمجھ لیں کہ معافی مانگ لی گئی ہے۔

صاف شیشے کی طرح زندگی گزارنے والے مجید نظامی ایک آمر کے سامنے اپنے دل کو خوشامد کی گرد سے آلودہ نہیں کر سکتے تھے۔ فوراً کھڑے ہو گئے اور بولے......

معافی کس بات کی............؟

یحییٰ خان نے کہا......

پھر ''مقدمہ لڑو''

مجید نظامی نے پوچھا

کہاں..........؟

یحیٰ خان بولے

مارشل لاء کورٹ میں

تو مجید نظامی بولے

''مارشل لاء نہ تو ''لا'' ہے اور نہ مارشل لا کورٹ، کورٹ ہے''

یحیٰ خاں نے مجلس برخاست کردی۔

جب مجلس برخاست ہوگئی تو حنیف رامے کہنے لگے

مجید نظامی تم نے ٹھیک نہیں کیا......اچھی خاصی معافی مل رہی تھی۔

کوثر نیازی کے ساتھ ساتھ حنیف رامے کے اخبار ''مساوات'' کے خلاف بھی مقدمہ تھا......لیکن مجید نظامی کے دل میں اپنے اصولوں کی وہ مشعل روشن تھی جو سدا فروزاں رہی۔ مجید نظامی عمر بھر اس شجر کی آبیاری کرتے رہے جس کی جڑیں تحریک پاکستان سے جڑتی ہیں اور وہ یہ شجر ہے جو کبھی بے برگ و بے ثمر نہ ہو سکا۔

71ء کی جنگ کو مجید نظامی اک ایسی جنگ سمجھتے ہیں جو یحیٰ خان پر مسلط کی گئی تھی اقتدار کا عشرہ منانے والے ایوب خان کے دور میں جب حالات خراب ہوئے تو اس نے یحیٰ خان سے مارشل لاء لگانے کے لئے کہا یحیٰ خان نے مناسب سمجھا کہ وہ خود مارشل لاء لگائے اور صدر کا عہدہ سنبھالے لہٰذا صدر ایوب کو مجبور اور معزول کر دیا گیا اور عنان اقتدار یحیٰ خان نے سنبھال لی۔ ایوب خان کا اقتدار اس بلبلے کی مثال ثابت ہوا جو سطح سمندر پر نمودار ہوتا ہے۔ ہوا کہ جھونکے آتے ہیں تو اس طرح سے بکھر جاتا ہے......گویا کبھی تھا ہی نہیں......

یحیٰ خان اس وقت کی تمام صورتحال کو سمجھتا بھی تھا اور ''الرٹ'' بھی تھا مگر ایک تو ورثے میں ملنے والی صورتحال کا کوئی حل تلاش نہ کر سکا اور دوسرا اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے اپنی ''مصروفیات دیگر'' میں سے وقت بھی نہ نکال سکا کیونکہ وہ ''ڈرنکر'' اور ''وومنائیزر'' تھا اور جنرل رانی کا ''جنرل'' زیادہ تھا۔

یحیٰ خان کی شخصیت کی خرابی کے علاوہ مغربی اور مشرقی پاکستان کا جغرافیائی فاصلہ بھی مسئلے کے حل نہ ہونے کی وجوہات میں شامل رہا۔ چوتھا کردار ''مکتی باہنی'' کا تھا......تاریخ کے

اوراق میں ان دنوں کا کرب اور ملال یادوں کا لبادہ اوڑھے اپنے نوکیلے اور اذیت ناک پنجوں کو گاڑھے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ ایسی صورتحال میں وہاں بھارت کی ہر قسم کی کمک بھی موجود تھی پاکستانی افواج مختلف شہروں اور چھاؤنیوں میں محصور تھیں جنگ سول وار کی صورتحال اختیار کر جائے اور اپنی آبادی ہی فوج کے خلاف ہو جائے تو جنگ لڑنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جنرل نیازی نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ کئی جرنیل برما کے راستے بھاگ نکلے اور کئی ہزار فوجی انڈیا میں جنگی قیدی ہوئے۔

مجید نظامی جنگی کی وجوہات پر غور کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تحریک پاکستان والا جذبہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اسے جاری وساری رہنا چاہئے تھا۔ ملک میں جمہوریت نہیں تھی صرف دس سال بعد ہی اسے دیس نکالا دے کر فوجی حکومت مسلط کر دی گئی تھی ...... قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان والوں کے پاس ایک ہی ''جرنیل'' بنگالی تھا۔ وہ بھی خواجہ شہاب الدین کا ایک کشمیری نژاد بنگالی بیٹا تھا بنگالی کہنے لگا'' اگر فوج نے ہی حکومت کرنی ہے تو ہمارا ایک ہی جرنیل تھا اب وہ بھی ریٹائرڈ ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہماری باری تو کبھی نہیں آ سکتی اور پنجابی سندھی بلوچ اور پٹھان آتے رہینگے''۔

ویسے وہ ساری فوج کو ''پنجابی فوج'' کہتے تھے جیسا کہ جغرافیائی فاصلے نے بھی مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں تعصب پھیلانے کا کام کیا تھا۔ کیونکہ وہاں آدھی آبادی ایسے ہندوؤں کی تھی جو اپنے خاندانوں کو بھارت بھیج چکے تھے مگر کاروبار کی وجہ سے خود مشرقی پاکستان میں مقیم تھے۔ بنگالیوں میں ان باتوں کے علاوہ یہ احساس بھی جڑ پکڑنے لگا تھا کہ مغربی پاکستان میں ہر چیز "Jute" سے بن رہی ہے۔ وہ لاہور آ کر گورنمنٹ کالج دیکھتے تو کہتے تھے یہ ''جوٹ'' سے بنا ہے۔ مال روڈ دیکھتے تو کہتے یہ ''ہمار جوٹ'' سے بنا ہے۔ بے وقعت اور بے نصیب باتوں کے انداز نے انہیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کی روح میں نفرت کا وہ جذبہ پرورش پانے لگا تھا کہ جو محبت میں قربانی دینے کے ہر جذبے کو سوکھی لکڑی اور ٹوٹی عمارت کی طرح بہا لے جاتا ہے اور شعور اس مٹی کے نیچے دفن ہو جاتا ہے کہ جہاں سوچنے سمجھنے کی تمام کھڑکیاں گرد آلود ہو جاتی ہیں اور انسانی افکار کہر آلود شام کے منظر میں ہی گم ہونے لگتے ہیں۔

اپنے نخچیروں کے ہاتھوں داغ داغ

بارھواں باب

جب شیخ مجیب کو وزیراعظم سہروردی کی لات پڑی

جن دنوں شیخ مجیب الرحمٰن "بنگلہ بندھو" بن کر ایک دھندلی شام کے ہمسفر تھے۔ انہی دنوں کے تاریک راستوں پر گزرتے ہوئے ازمنہ ماضی میں گم مجید نظامی کو ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے کہ جب سہروردی وزیراعظم تھے ان دنوں ان کی طبیعت ناساز تھی۔ مجید نظامی سہروردی کو لندن کے زمانے سے جانتے تھے۔ ناسازی طبع کی وجہ سے سہروردی بستر پر لیٹ کر کام کیا کرتے تھے۔ جسٹس انوارالحق اس وقت سی ایس پی تھے جو بعد میں ڈیفنس سیکرٹری بھی رہے۔ انوارالحق ایک فائل لے کر آئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن اس وقت سہروردی کے پاؤں دبا رہے تھے۔ انوارالحق نے دیکھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے باتوں باتوں میں کہیں "بنگلہ دیش" کا لفظ بول دیا سہروردی نے غصے سے لات ماری اور شیخ مجیب چاروں شانے چت پلنگ سے نیچے جا پڑے............

مجید نظامی کی مجیب الرحمٰن سے اس وقت بھی ملاقات ہوئی جب وہ میانوالی جیل سے رہا ہوئے تھے اور لندن سے واپسی پر ملک غلام جیلانی کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ملک کا حکمران بننے کے لئے شہ زور ہونا بھی ضروری ہوتا ہے ورنہ تو منہ زور بھی تاج وتخت سنبھال لیتے ہیں۔ مجیب نہ تو نجیب تھا اور نہ ہی شہ زور۔

جن دنوں مجیب الرحمٰن الیکشن جیت چکے تھے مجید نظامی نے ان سے کہا شیخ صاحب میں نے آپکے امیدوار ملک حامد سرفراز کو ووٹ دیا تھا۔ اب بھی ہم آپ کی پارٹی کو سپورٹ کریں گے...... آپ نے پارلیمانی الیکشن جیتا ہے، راولپنڈی آئیں وزارت بنائیں، تو وہ فرمانے لگے میرے لئے راولپنڈی بیٹھ کر حکومت کرنا مشکل ہے۔ مجھے کوئی حکومت کرنے نہیں دے گا۔ لہٰذا میں ڈھاکہ بیٹھ کر حکومت کرنے کو ترجیح دوں گا۔ لیکن مجید نظامی سمجھ چکے تھے کہ مجیب الرحمٰن راولپنڈی آکر حکومت نہ کرنے کا اگر بہانہ نہیں بنا رہا تو یہاں آنے کی ''ہمت'' نہیں کر رہا اور اتنا ''بہادر'' ہے کہ اپنے ملک میں حکومت نہیں کرنا چاہتا۔

البتہ یہ بات الگ ہے کہ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو حقائق پر توجہ نہیں دے رہے تھے صرف سطحی چیزوں پر نظر رکھے ہوئے تھے اور گرد و پیش کے حالات کی اہمیت سے بے خبر چمکتے ہوئے ''اقتدار'' نے ان کی آنکھوں پر بھی پردے ڈال دیئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے ''جو کوئی اسمبلی کے اجلاس میں ڈھاکہ جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔'' لیکن ان دنوں اگر جمہوری نظام حکومت ہوتا تو ملک کو دولخت ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔ ان کے علاوہ ملک کے ٹکڑے ہونے میں شیخ مجیب الرحمٰن کا یہ ڈر بھی شامل تھا کہ فوج کی حکومت میں ہمارا کیا مقام رہ جائے گا۔ بھٹو کی ہٹ دھرمی یہ دن دکھایا تھا کہ جس نے نعرہ لگایا ''ادھر تم ادھر ہم......''

کیونکہ بھٹو کو یہ احساس ستانے لگا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان ساتھ رہتا ہے تو بھٹو کے لئے وزیراعظم بننا دشوار ہو جائے گا کیونکہ وہ ایک صوبہ آبادی کے حوالے سے باقی پاکستان کی اکثریت سے زیادہ تھا۔ لہٰذا بھٹو اپنا پیش رو خود ہی بن گیا اور بٹورنے اور بٹوارے کرنے کے

فارمولے پر عمل کرنے لگ گیا۔ لیکن عوامی لیگ کی اکثریت حاصل کرنے کے بارے میں مجید نظامی کہتے ہیں کہ ان دنوں مسلم لیگ نہ ہونے کے برابر تھی اور جماعت اسلامی مارشل لاء کی ''بی ٹیم'' بننے کی وجہ سے ہار گئی تھی لہٰذا عوامی لیگ جیت گئی مگر وہ جیت کر بھی ہار گئے کیونکہ عوامی لیگ اپنی حیثیت برقرار نہ رکھ سکی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ملاقاتوں کو یاد کرتے ہوئے مجید نظامی کہتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن کوئی ''انٹلکچوئل'' آدمی نہیں تھا وہ جذبات کو Exploit کرنا جانتا تھا اور باتوں کی ''کھٹی'' کھاتا تھا اسی لئے اس کے Follower نہیں رہے اور اپنی باتوں کا ''پھل'' مجیب الرحمٰن کو یہ ملا کہ پورے خاندان کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ اس کی بیٹی بچ گئی بعد میں وہ وزیراعظم بنی مگر اسے بھی مسز ضیاء نے شکست دے دی۔

اس کے مقابلے میں مشکوک بیک گراؤنڈ کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو پڑھا لکھا، بیرسٹر اور زمیندار تھا اس کا ووٹ بنک بھی تھا اور اب بھی ہے۔ مگر بھٹو کو جتنی جلدی عروج ملا وہ اتنی جلدی زوال پذیر بھی ہوا۔ کیونکہ بھٹو اپنے مزاج کی وجہ سے اس عروج کو قائم نہ رکھ سکے۔ ذوالفقار علی بھٹو ان دنوں ایوب خان کو ''ڈیڈی'' کہا کرتے تھے.......... بنیادی طور پر وہ ہر حال میں ''اقتدار'' چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستانی بھی تھے اور پاکستان کو بھی مضبوط دیکھنا چاہتے تھے اس کا ثبوت ان کے چند کارنامے ہیں جن میں ڈاکٹر قدیر کو وطن واپس بلانا بھی شامل ہے۔ بھارت نے پہلے ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ طاقت کا توازن خراب نہ ہونے پائے...... ذوالفقار علی بھٹو نہ امریکہ کو خوش رکھ سکے اور نہ ہی سوشلزم ہماری معیشت ہے کا نعرہ بلند کر کے روس کو قائل کر سکے کہ وہ ان کے آدمی ہیں۔ یوں بھی پاکستان ہمیشہ سے ''مسائلستان'' رہا ہے۔ کچھ مسائل قدرتی طور پر موجود تھے اور کچھ ان کے خود پیدا کردہ تھے اور یہ پیدا کردہ مسائل ان کی افتاد طبع اور سیاست کے سٹائل کی وجہ سے تھے۔ انہوں نے فوج سے اقتدار حاصل کیا تھا لیکن فوجیوں کے ذریعے ہی اقتدار کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی اور پولیس اور ایجنسیوں کو اپنی طاقت اور قوت کا ذریعہ بنانے کی تگ ودو میں لگے رہے۔

بھٹو نے دراصل معاہدہ تاشقند کو Exploit کیا تھا اس نے یو این میں قرارداد پھاڑی اور جو ڈرامہ کرنا تھا کیا۔لیکن بھٹو جب واپس آئے تو ان کی سیاسی محاذ آرائی شروع ہو چکی تھی لٰہذا بھٹو کو ایوب خان نے سبکدوش کر دیا قدرت انسان کو اس کی کمزوریوں کی وجہ سے اپنی عظمت کا احساس دلا کر نصیحت کرواتی ہے۔

مجید نظامی بھٹو کو لندن سے جانتے تھے۔بھٹو جن دنوں لندن آیا کرتے تھے ان دنوں ان کا Portfolio فارن نہیں تھا لٰہذا جب مجید نظامی اپنے دوستوں کے ساتھ بریفنگ کے لئے ہائی کمشن جاتے تو بھٹو سے ملاقات ہوتی تھی۔بعد میں جب مجید نظامی لاہور آ گئے تو بھٹو ان سے ملنے ''شاہ دین'' بلڈنگ آیا کرتے تھے۔ مجید نظامی انہیں کبھی ''ہیکو ریسٹورنٹ'' اور کبھی ''گارڈینیا'' لے جایا کرتے تھے۔بھٹو کی شخصیت کے بارے میں مجید نظامی کہتے ہیں کہ بھٹو ''ایکسٹرا اسمارٹ'' تھے۔جہاں تک سیاسی پیروکار دوستوں کا تعلق ہے خواہ سندھی ہوں خواہ پنجابی ان میں ''Tolerance'' کا مادہ کم تھا۔

کیونکہ وہ سب کے سامنے کسی کی بھی توہین کر کے بڑا ''لطف'' اٹھانے کے آہستہ آہستہ عادی ہو چکے تھے۔گفتار کا چشمہ ''طوفان'' کی طرح سماعتوں پر گرے تو محبت واحترام کے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔مگر ''مدہم'' آواز دلوں میں ایسا ترنم پیدا کر دیتی ہے جو انسان کی روح تک اثر انداز ہو کر رفاقت کے نئے دریچے کھول دیتی ہے۔

مجید نظامی کہتے ہیں ذوالفقار علی بھٹو اپنے اس رویے کی وجہ سے رفتہ رفتہ ساتھیوں کی دلی یا حقیقی حمایت سے محروم ہوتے گئے۔بھٹو دراصل پہلے ''سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر'' تھے انہوں نے ''بند گلے'' کے کوٹ والی یونیفارم بھی اپنی کابینہ کے لئے متعارف کروائی تھی جس کے ساتھ پتلون پر ایک دوسرے رنگ کا ''پیچ'' لگا ہوا تھا جو بالعموم ''بینڈ'' بجانے والوں کی وردی پر ہوا کرتا ہے۔

مجید نظامی صاحب فہم وادراک ہیں لٰہذا کہتے ہیں کہ یہ ایک قسم کا پولیٹیکل ''مافیا'' تھا۔

اس لئے کوئی جڑ نہیں پکڑ سکا اور وہ اپنا ''عشرہ'' بھی نہ منا سکے اور مڈ ٹرم الیکشن میں اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دراصل ''اعمال'' کو ''ایمان'' سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا روزمرہ کے اصولوں کو اخلاقیات کے دائرہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ روزانہ کی زندگی کا معمول اخلاق حسنہ سے ہی ترتیب پائے تو اصلاح معاشرہ کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔

لیکن ''پی پی پی'' کو اس وقت ''پیو پلاؤ پارٹی'' بھی کہا جانے لگا تھا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ پینا، پلانا اور ڈانس میوزک ''آزادی'' سے جینے کے راستے ہیں۔ وہ آزادی اور ''بیباکی'' کے فرق کو نہیں سمجھ سکے تھے جیسا کہ موجودہ دور میں بھی یہی صورتحال ''روشن خیالی'' کے نام پر سامنے آ رہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اس وقت کے ہنگاموں میں بھارتی کلچرل یلغار کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ چونکہ ان کے ساتھ بھٹو کا پولیٹیکل ''اٹ کھڑکا'' تھا۔ ویسے بھی ایوب خان کے ساتھ ''تاشقند'' جانے اور یو این میں قرارداد پھاڑنے کے بعد بھٹو کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ انڈیا کے معاملے میں کوئی ''یوٹرن'' لیتے۔ جس طرح کہ آجکل ہر معاملے میں جاری ہے۔ بھٹو اس معاملے میں ''ہارڈ لائنر'' تھے۔

ماضی نہ بھولنے والے واقعات سے ترتیب پاتا ہے۔ مٹتے ہوئے نقوش میں سے بھی کئی مناظر نگاہوں کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور کئی مناظر تیزی کے ساتھ غائب ہو جاتے ہیں لیکن اپنا نقش پا آنے والے وقتوں کی گہرائیوں تک چھوڑ جاتے ہیں۔ بے شک انسان ''فانی'' ہے مگر وہ باتیں ''جاودانی'' ہیں جو تاریخ کا حصہ بن رہی ہوتی ہیں۔ ایوب خان کے دور میں جب بھٹو کو وزارت خارجہ سے فارغ کر دیا گیا تھا...... ان دنوں مجید نظامی زیڈ اے سلہری کے ساتھ بھٹو کو ملنے راولپنڈی گئے تھے۔ بعد میں پتہ چلا سلہری صاحب کا مشن کچھ اور تھا۔ چائے پر گپ شپ ہوئی تو بھٹو تقریباً رونے پر آئے ہوئے تھے۔ مجید نظامی اور ذوالفقار علی بھٹو کا سن پیدائش بھی 1928ء ہے۔ ہم مزاج تو نہیں لیکن ہم عمر ہونے کی وجہ سے مجید نظامی نے بھٹو سے پوچھا...... آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ ابھی تو آپ نوجوان ہیں اور آپ کے لئے بہت سا وقت پڑا ہوا

ہے۔ آپ سمجھیں کہ آپ کو ایک موقع اور مل رہا ہے اور اچھا موقع، آگے بڑھنے کا موقع۔ آپ ''وزیر'' بننے کی بجائے ''اپوزیشن'' میں آئیں اور اپوزیشن کو تیار کریں کہ وہ ایوب خان کا مقابلہ کرے...... بھٹو کو یہ بات اچھی لگی لیکن مصائب کا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔ کہنے لگے۔

بات تو ٹھیک ہے لیکن جو راستے کی دشواریاں ہیں ان کا کیا ہوگا۔

مجید نظامی نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا

آپ ان دشواریوں کی قطعاً پروا نہ کریں اور آگے کی طرف قدم بڑھائیں...... اللہ تعالیٰ آپ کا ساتھ دے گا۔

دراصل ''توکل اللہ'' نہ ہونا ہی انسان کو بزدل بناتا ہے..... مگر مجید نظامی صعوبتوں کو خدا کی رضا سمجھ کر عبور کرنے والوں میں سے ہیں۔

تیرھواں باب

بھٹو صاحب آخر بھٹو تھے!

دشواریوں، پیچیدہ گھاٹیوں اور سفر کی مشکلات میں اعتماد و یقین کی راہیں جب متزلزل دکھائی دے رہی ہوں تو کسی ''خوش یقین'' کا ساتھ از سر نو تازگی حیات کی خبر دینے لگتا ہے۔ ایسا ساتھ ''نعمت خداوندی'' ہی قرار دیا جا سکتا ہے......

مجید نظامی کا بھی دل بھٹو کی حالت زار پر پسیج گیا تھا لہٰذا اس واقعے کے فوراً بعد ''یوم حمید نظامی'' کے موقع پر مجید نظامی نے بھٹو کو جلسہ کی ''صدارت'' کے لئے بلایا اور یہ اہتمام YMCA ہال لاہور میں کیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ باہر صحن، سیڑھیوں اور سڑک تک کھڑے تھے۔ مال روڈ پر ٹریفک جام تھی...... اپنی ''خواہشوں'' کی تحریک ''تحریک پاکستان'' کے ساتھ جوڑ کر صداقت کے راستے پر چلنے والوں کا ہمرکاب ہونے پر خیر مقدم کا یہی انداز پذیرائی ہو سکتا تھا کہ جب جلسہ ختم

ہوا تو باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا لہٰذا ذوالفقار علی بھٹو کو وائی ایم سی اے کی دائیں سائیڈ سے لکڑی کی سیڑھی لگا کر اتارا گیا اور ان کی اقامت گاہ تک پہنچانے کے لئے مجید نظامی کو ڈاکٹر مبشر سے درخواست کرنا پڑی کہ وہ یہ فریضہ سرانجام دیں۔ان کے پاس امریکن شیورلیٹ گاڑی بھی تھی۔ جس کے بعد نہری انجینئر ڈاکٹر مبشر کو بعد میں مجید نظامی نے ان کی خواہش پر تعارفی ''خط'' بھی دیا جس کے بعد ڈاکٹر مبشر پیپلز پارٹی کے ''سیکرٹری جنرل'' اور پھر ''وفاقی وزیر'' بھی بنے......وہ ''فیملی فرینڈ'' تھے لیکن انہوں نے ہی مجید نظامی کے ہی خلاف ''کوڈنا'' کروا دیا کیونکہ مجید نظامی نے سوشلزم کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کے بعد مجید نظامی کو نوائے وقت چھوڑ کر ''ندائے ملت'' نکالنا پڑا تھا۔لیکن ''بھٹو'' کو حیات نو دینے کے لئے مجید نظامی نے لہو گرم رکھنے کا طریقہ بتا دیا تھا......

بھٹو کے بارے میں مجید نظامی کی بڑی دلچسپ ''یادیں'' ہیں ...... جب ایوب خان کے دور میں بھٹو کے خلاف پہلا مقدمہ چلا تو مجید نظامی باقاعدگی سے کارروائی سننے لاہور بورسٹل جیل جایا کرتے تھے۔ایک مرتبہ مجید نظامی نے بھٹو سے شکایت کی کہ یہ آپ ''سوشلزم'' کا کیا شوشہ چھوڑ رہے ہیں یہ تو ہمیں ''مکے'' کی بجائے ''ماسکو'' لے جا سکتا ہے......کیونکہ سوشلزم لانے کے لئے آپ کو اتنا لیفٹسٹ ہونا پڑے گا یا مشرقی یورپ کے بلاک سے ''فلرٹ'' کرنا پڑے گا کہ اور آپ کو پاکستان کا قبلہ ہی تبدیل کرنا پڑے گا۔جواباً بھٹو کہنے لگے......

یہ سب کچھ فلانے ڈھینگے جے اے رحیم نے کیا ہے ...... مجھے باہر آ لینے دو......سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن مجید نظامی کہتے ہیں کہ باہر آ کر انہوں نے جے اے رحیم یا سوشلزم کو کیا ٹھیک کرنا تھا بلکہ ''ہمیں'' ہی ٹھیک کرنا شروع کر دیا...... کیونکہ مجید نظامی نے جب بھی ''سوشلزم'' کے خلاف لکھا۔بھٹو نے سمجھا کہ میری پارٹی کے خلاف لکھا گیا ہے۔اس دن کے بعد سے مجید نظامی اور بھٹو کا دوستانہ بھی رہا لیکن سیاسی اختلافات بھی شروع ہو گئے۔مجید نظامی کہتے ہیں کہ میں انہیں Man

of Contradictions سمجھتا تھا...... کیونکہ وہ جو کچھ کر رہے تھے محض ''اقتدار'' کی خاطر اور اقتدار بھی کلی طور پر کہ جو فوجی ڈکٹیٹرشپ سے کم نہیں ہوتا۔ اسی لئے جب انہوں نے ''ٹیک اوور'' کیا تو وہ پاکستان کے پہلے ''سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر'' بنے اور یہ آئین کا تقاضا نہیں تھا کہ وہ سویلین مارشل ایڈمنسٹریٹر بنتے، یہ خلاف آئین حرکت تھی۔

انہی دنوں بزرگ ایڈیٹر مصطفیٰ صادق نے بھٹو کے ساتھ ایک ملاقات کا اہتمام کیا۔ مجید نظامی سمجھے کہ یہ ملاقات ''دوستانہ'' اور ''سیاسی'' نوعیت کی ہوگی اور بھٹو کا خیال تھا کہ مجید نظامی ''اشتہارات'' کی بات کریں گے لیکن مجید نظامی نے ''اس'' طرف کوئی اشارہ نہ کیا۔ ملاقات کے اختتام پر بھٹو مصطفیٰ صادق سے کہنے لگے......

یار اشتہارات کی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی اگر ایک بار نظامی صاحب اشتہارات کے لئے کہہ دیں تو میں اشتہارات کی بارش کر دوں۔

مجید نظامی نے جواب دیا...... میں اس مقصد کے لئے آپ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ میں تو مصطفیٰ صادق کے کہنے پر آپ کے ساتھ چائے کی پیالی پینے آیا تھا ایسی بات میری زبان سے آپ نہیں سن سکتے۔

مجید نظامی کے قدم کسی بڑے اور عظیم مقصد کے حصول کے لئے ہی اٹھ سکتے تھے کیونکہ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو سیم وزر کی دیواروں پر بیٹھ کر خوشی کے نغمے نہیں الاپ سکتے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ جو یقین اور اعتماد کی مسرت و شادمانی کے حصار میں رہ کر نفسانی خواہشات کی یورش کو مسمار کر سکتے ہیں اور اپنی ''منفرد'' شناخت کے ساتھ اس وادی میں جا کر آباد نہیں ہو سکتے کہ جہاں بہت سارے ایسے افراد کا مجمع ہو جو غرض کے جھوٹے رشتوں کی زنجیر میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔

مجید نظامی مانتے ہیں کہ بھٹو کے خلاف چلنے والی تحریک میں انہوں نے ''قومی اتحاد'' کو سپورٹ کیا تھا لیکن جب اسمبلی کے چیمبر پر بھٹو کے خلاف جلوس آنا تھا تو بھٹو نے مجید نظامی کو گورنر

ہاؤس میں ''یاد'' کیا اور کہا......

اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟

مجید نظامی نے مشورہ دیا

بھٹو صاحب! آج خواتین کا جلوس ہے، آپ ان پر لیڈی پولیس نہ چھوڑیں، کیونکہ میں نوائے وقت کے دفتر سے آرہا ہوں ہمارے سامنے ''تھانہ سول لائنز'' ہے۔ وہاں بڑی تعداد میں لیڈیز پولیس تعینات ہے۔ یقیناً وہ کوئی ''ایکشن'' لے گی......

انہوں نے ''وعدہ'' کیا کہ ایسا نہیں ہوگا......لیکن بعد میں اطلاع ملی کہ وہ آپریشن ''خود'' سپروائز کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب آخر بھٹو صاحب تھے!

ایوب خان کی کشیدگی کے دنوں میں بھٹو جب سرکاری دورے پر لاہور آتے تو ''گورنر ہاؤس'' یا ''سرکٹ ہاؤس'' کی بجائے ''فلیٹیز'' ہوٹل کے سویٹ نمبر 56 میں قیام کرتے۔ لاہور میں ہی نوائے وقت کے چیف رپورٹر سے ایک مرتبہ بھٹو نے نہایت شیریں انداز میں التجا کر کے پوچھا...... یہ نوائے وقت ان دنوں مجھ پر اتنا ''مہربان'' کیوں ہے...... چیف رپورٹر نے جواب دیا اس لئے کہ آپ ایوب خان کے خلاف ہیں اور نوائے وقت ''جمہوریت'' کا ترجمان ہے......شاید بھٹو نہیں جانتے تھے کہ تحریک پاکستان میں عظیم جدوجہد سے محبت کرنیوالے حیرت انگیز لوگ ''شخصیت پرستی'' کے جعلی بت تعمیر نہیں کر سکتے۔ بلکہ قوموں کے مستقبل کے لئے ''وطن پرستی'' کی ''آتش'' میں جل رہے ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کی دوستی کا رشتہ ملک وقوم کا تحفظ کرنے والے ''معماروں'' کے ساتھ ہی جڑ سکتا ہے......مگر اپنے ہی گھر کے در و دیوار ''مسمار'' کرنے والوں کے ساتھ نہیں......

بقول اقبالؒ:

کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا
دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا

1977ء میں بھٹو کے خلاف جب تحریک اپنے عروج کو پہنچی تو بھٹو نے خواہش ظاہر کی

نظامی صاحب...... میں مولانا مودودی سے ملنا چاہتا ہوں۔

مجید نظامی نے کہا بہتر ہے آپ ''فلاں'' آدمی سے کہیں وہ انہی کے ''حلقہ بگوش'' ہیں۔

لیکن بھٹو اصرار کرنے لگے تو مجید نظامی نے مولانا مودودی سے ملاقات کی۔ مولانا مودودی نے کہا کہ وہ چند شرائط لکھ دیتے ہیں اگر بھٹو صاحب یہ شرائط مان لیتے ہیں اور اخباری بیان جاری کر دیتے ہیں۔ تو وہ ''اچھرہ'' تشریف لا سکتے ہیں...... بھٹو کے اصرار پر مجید نظامی نے اسی شام ''پی آئی اے'' سے کراچی پہنچ کر بھٹو کو مولانا مودودی کا خط دیا۔ بھٹو نے وہ خط پڑھا اور کہا ''مجھے مولانا کی شرائط منظور ہیں''۔

ان خطوط پر بیان جاری ہو گیا۔ اخبارات میں چھپ گیا...... چنانچہ ملاقات طے پا گئی...... کیا بات ہوئی...... اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا...... البتہ بھٹو نے دوبارہ مجید نظامی سے درخواست کی کہ میں نوابزادہ نصر اللہ کے گھر جانا چاہتا ہوں...... تو مجید نظامی نے جواب دیا:

بھٹو صاحب! میں ''صلح کرالو'' قسم کا پروفیشنل آدمی نہیں ہوں۔ مولانا مودودی سے ملنے کی آپ نے درخواست کی جو ''قومی'' مسئلہ سمجھتے ہوئے میں نے پوری کر دی۔ تا کہ اگر کوئی ''انڈر سٹینڈنگ'' ہو جائے تو ملک کے لئے بہتر ہو۔ آپ بھی بچ جائیں اور صورتحال بھی بچ جائے۔

بعد میں کسی اور کی مساعی سے بھٹو نوابزادہ سے ملنے کے لئے گئے۔ مجید نظامی کہتے ہیں کہ بھٹو کے ساتھ ''دوستانہ'' یا ''مخالفانہ'' تعلقات کے دوران ''سیاسی'' مخالفت تو رہی لیکن ذاتی دشمنی نہیں تھی کیونکہ جس طرح انہوں نے سیالکوٹ کے ایک ایم این اے ملک سلیمان کی پٹائی کروائی تھی اور جن کی بیوی کو بھی تھانے لے جایا گیا تھا اور جو بعد میں انور عزیز کے خلاف جیت بھی گئے تھے...... اس قسم کا واقعہ ذاتی دشمنی کا ''شاخسانہ'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال وہ اقتدار ہاؤس سے جیل گئے۔ پھانسی چڑھ گئے۔ لیکن نہ سجدہ سہو کیا نہ صلح صفائی پر آمادہ ہوئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

چودھواں باب

بھٹو، آئین سازی اور اسلامی کانفرنس

مجید نظامی قوم کے لئے ناہموار راستوں کو تراشنے والوں کو ''عظیم'' قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کسی بھی حکمران کو ''یوم حساب'' کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اپنے ہر عمل میں ''حکم ربی'' کو تسلیم کرنا چاہئے۔ اپنے لئے آرام و آسائش سے بھرپور زندگی کا انتخاب کر کے پر شکوہ ایوانوں اور ریاکاری کے محلات میں رہنے والے حکمران بے چاری اور دل شکستہ عوام سے دور رہتے ہیں، اسی لئے ان کی عمارتوں کے در و دیوار سازشوں کے گھروندے بن جاتے ہیں۔ ایسی تمام حویلیاں وہ مقبرے ہیں جہاں جھوٹ کا مسکن ہے اور غریب عوام ان ''محلوں'' کو صرف نم آلود آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ پاکستان کے تمام حکمران رہن سہن کے ایسے انداز اختیار کر لیتے ہیں کہ جیسے ان کی

''جڑیں'' پاکستان کے کسی عام گھرانے سے نہیں بلکہ کسی ''شہنشاہ'' کے محل سے جا ملتی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے انداز حکمرانی بھی ایسے ہی تھے لیکن اچھی بات یہ تھی کہ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے وہ ملک وقوم کا درد بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے ملک کو متفقہ ''آئین'' بھی دیا جو ابھی تک مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ''اسلامی کانفرنس'' کا انعقاد کروانا بھی ان کا عظیم کارنامہ ہے کیونکہ پاکستان کی بظاہر منزل بھی ''اسلامزم'' تھی تاکہ سرزمین پاکستان کو ''اسلامی قوت'' اور ''اسلامی اتحاد'' کے لئے بھی استعمال کیا جا سکے۔ کانفرنس کامیاب تھی...... ڈھانچہ بھی تیار ہو گیا تھا لیکن سعودی فرمانروا شاہ فیصل ''شہید'' کر دیئے گئے۔ لہٰذا جو ''ڈھانچہ'' تیار ہوا تھا اس پر ''عمارت'' تعمیر نہ ہو سکی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بھٹو کی پھانسی کے ''ڈانڈے'' بھی واشنگٹن سی آئی اے سے جا ملتے ہیں۔ جس طرح بھٹو کو پھانسی دینے والے جنرل ضیاء الحق بھی بعد میں ہوا میں امریکہ کی سازش کا شکار ہو گئے۔

بھٹو کے دور میں کرنل قذافی انقلابی ہوا کرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں یہ ''رمق'' ختم ہو چکی ہے، اور آج کل تو وہ بھی بش کا Pet بننے کو بے تاب ہے۔ کرنل قذافی نے جنرل ضیاء سے بھٹو کو مانگ بھی لیا تھا کہ تم اسے ''پھانسی'' نہ دو تو اس کی ذمہ داری میں لیتا ہوں...... انہی دنوں فلسطین کے لیڈر یاسر عرفات کو بھی ''آؤٹ آف پروپورشن'' اہمیت ملی ہوئی تھی۔

شیرون جو آجکل کومے میں ہے ممکن ہے ان سطور کی اشاعت تک دوسری دنیا میں پہنچ چکا ہو، کے دور میں یاسر عرفات فلسطینی اتھارٹی کے ''لیڈر'' تھے...... وہ کتنے ''بے اثر'' لیڈر تھے اس بات کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ پہلی مرتبہ اب جبکہ آزاد الیکشن کا انعقاد ہوا تو ''الفتح'' کی بجائے ''حماس'' جیت گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلسطینیوں میں ان کی موثر اپوزیشن موجود تھی۔ لیکن اس وقت چونکہ یاسر عرفات فلسطینیوں کے لیڈر مانے جا چکے تھے اس لئے صرف انہیں اہمیت دی جاتی تھی۔ انہیں بھاری بھرکم بجٹ بھی ملا کرتا تھا۔ یاسر عرفات پاکستان کے مقابلے میں انڈیا کے حمایتی تھے۔

ڈاکٹر قدیر کو Beg, Borrow or Steal کہہ کر پاکستان کے لئے ''ایٹم'' حاصل کرنا ذوالفقار علی بھٹو کا عظیم کارنامہ ہے۔ڈاکٹر قدیر کو ملک کے اندر بھٹو کے علاوہ ضیاء الحق، نواز شریف اور بے نظیر بھٹو نے بھی ''سپورٹ'' کیا......فوج سمیت ڈاکٹر قدیر کی سب نے ہمیشہ پذیرائی کرتے رہنا ہی اپنا فرض اولین سمجھا۔کیونکہ ڈاکٹر قدیر نے سمندر کی گہرائی سے موتی لاکر محبوب وطن کو تحفتاً پیش کر دیا تھا۔طاقتور جوشیلے محبِ وطن افراد ناقابل تسخیر قلعوں کی تعمیر کیا ہی کرتے ہیں۔اور ایسے ہنر مند ہاتھوں اور روشن دماغوں کی نقش نگاری کی حفاظت آنے والی نسلوں کا فریضہ بھی بن جایا کرتی ہے۔پہاڑ اپنے سینوں میں محفوظ قیمتی پتھروں کا خزینہ آباد رکھتے ہیں تب ہی تو ویرانوں اور کھنڈرات سے مختلف اور پر شکوہ دکھائی دیتے ہیں۔

مجید نظامی ڈاکٹر قدیر کے بارے میں کہتے ہیں کہ پہلے پہل وہ انہیں پنجابی سمجھتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ میں ان کے خلاف ہوں۔لیکن بعد میں انہیں باور ہو گیا کہ میں پنجابی ضرور ہوں مگر پہلے ''پاکستانی'' ہوں۔اس کے علاوہ ڈاکٹر قدیر یہ بھی سمجھتے رہے کہ میں ڈاکٹر شیخ منیر احمد کے حق میں ہوں، شیخ منیر احمد شیخ خورشید احمد مرحوم کے بھائی تھے، جو بعد میں ایوب خان کے دور میں لاء منسٹر بھی بنے اور تحریک پاکستان کے ایم ایس ایف کے دور میں حمید نظامی کے ساتھ انہوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔چیئرمین اٹامک انرجی کمشن ڈاکٹر منیر احمد نے بھی پاکستان کے نیوکلیئر معاملات میں اہم رول ادا کیا ہے۔

منیر احمد خاموش طبع آدمی تھے......بات بھی سرگوشی میں کیا کرتے تھے۔جبکہ ڈاکٹر قدیر کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ''پبلسٹی'' کے شوقین تھے......ڈاکٹر منیر احمد نے بڑی خاموشی کے ساتھ اس پروگرام کو آگے پہنچانے میں اہم رول ادا کیا لیکن زیادہ ''نام'' ڈاکٹر قدیر نے کمایا۔اور اب تو وہ ''محسن پاکستان'' ہیں اور قوم کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔مجید نظامی ڈاکٹر قدیر کی نظر بندی کے خلاف ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یہ سمجھتے ہیں ایک ''ہیرو'' نظر بند ہے کیونکہ قوم آج محفوظ بھی ہے تو خدا کی رحمت کے بعد ڈاکٹر قدیر کی کاوشوں کی وجہ سے محفوظ ہے۔بھارت نے بم بنانے والے

مسلمان سائنسدان کوصدر بنالیا ہے،ہم نے اپنے ہیروکوامریکہ کے کہنے پرنظر بند کر دیا ہے۔

مجید نظامی موجودہ صورتحال پرگفتگوکرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر قدیر پرالزام ہے کہ انہوں نے ایران کو کچھ چیزیں بیچ دی تھیں۔ کہوٹہ کے انچارج کو بھی کچھ دن تک پکڑے رکھا حالانکہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ چھپ کر ''جیب'' میں ڈال کر دے دی جاتی۔ اگر ایسا ہوا ہے تو سب کے علم میں ہے اور فوج کے علم میں بھی ہوگا۔ جوان کی نگران تھی۔ مجید نظامی کہتے ہیں کہ جب میں K.R.L گیا تھا تو باوردی فوجی ڈاکٹر قدیر کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔ ڈاکٹر قدیر کا پہلا انٹرویو کرنے کا اعزاز مجید نظامی اور نوائے وقت اسلام آباد کی ٹیم کو حاصل ہوا تھا............

مجید نظامی کہتے ہیں کہ ضیاء الحق، نواز شریف اور بے نظیر بھٹو پاکستان کو''نیوکلیئر'' پاور بنانے والوں میں صف اول میں شامل ہیں......مگر ذوالفقار علی بھٹو صف اول سے بھی آگے ہے اور وہ ''بم کا باپ'' ہے اور ان کے اس اعزاز میں نواز شریف بھی شامل ہیں۔ بھٹو اگر یہ فیصلہ اس وقت نہ کرتا اور نواز شریف دھماکہ نہ کرتا تو ہمارا "Survival" دشوار ہو جاتا۔

اس مقصد کے لئے بلائی گئی ایڈیٹرز میٹنگ میں مجید نظامی نے وزیراعظم نواز شریف سے سخت لہجے میں کہا تھا کہ اگر آپ نے دھماکہ نہ کیا تو ہم آپ کا دھماکہ کر دیں گے۔ اور جب چاغی میں جا کر نواز شریف نے دھماکہ کر دیا تو نظامی صاحب کوفون کر کے دھماکہ کر دینے کا مژدہ سناتے ہوئے کہا سب سے پہلے آپ کوفون کر رہا ہوں۔

اب جہاں تک ایران کا تعلق ہے مجید نظامی کو تہران جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ وہ کہتے ہیں ایران ہتھیار کی ''زبان'' استعمال کرتا ہے اور ایرانی ہتھیار استعمال بھی کرتا ہے......تہران میں قیام کے دوران مجید نظامی کو ان کے ''ملاؤں'' سے بات چیت کرنے اور ایران کا سیٹ اپ دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ''ملا'' سے وہاں کے ''ملا'' مختلف ہیں، جو ٹائی نہیں لگاتے مگر کوٹ پتلون پہن لیتے ہیں۔

مجید نظامی ایک بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ عقل ''علم'' کے بغیر کچھ نہیں ہوتی، علم بھی دور

حاضر کا علم .... عقل وعلم کا امتزاج ہی عالم و فاضل کو اس پڑھے لکھے سپاہی کی حیثیت سے متعارف کروادیتا ہے جو ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان جنگ میں اترتا ہے۔ ایرانی ''مجتہد'' عقل وعلم کے ہتھیاروں سے لیس سپاہی ہیں اور ان کا ملک اس دور میں گھوڑوں سے بھی پاکستان کی طرح لیس ہے جس کا حکم قرآن مجید نے دیا ہوا ہے کہ تم اپنی استطاعت کے مطابق دشمنوں کے مقابلے میں گھوڑوں اور اسلحہ سے لیس رہو۔

موجودہ حکمران محمود نژادی تو ''عوامی'' ہیں اور عام غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ پیشے کے لحاظ سے لوہار ہیں لیکن سوسنار کی ایک لوہار کی...... ! نہ ملا ہیں نہ جنرل۔

مجید نظامی سچائی کے بلند مینار کی قدر و قیمت سمجھتے ہوئے کہتے ہیں ''بڑے عرصے کے بعد ایک مسلم مشرقی طاقت پورے مغرب کے لئے ''لوہے کا چنا'' ثابت ہو رہی ہے۔ اسرائیل کہتا ہے کہ یہ ''ہٹلر'' کی طرح ہے اور ذہنی طور پر ''سٹیبل'' نہیں ہے۔ دراصل اسرائیل اور امریکہ سے جو نہیں ڈرتا وہ اسے ''سٹیبل'' نہیں سمجھتے۔ مجید نظامی کا خیال ہے کہ امریکہ اور اسرائیل اندر سے ایک ہیں ''ان سٹیبل'' نژاد کے ایران نے ان کی نیند حرام کر دی ہے انہیں ''ان سٹیبل'' کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اب صورتحال یہ ہے کہ روس بھی ایران کی پشت پر ہے...... چین بھی ایران کے خلاف نہیں ہے۔ ہم پتہ نہیں کہاں کھڑے ہیں۔

پہلے تو مقصد تھا کہ اس ایریا میں روس کو نہ آنے دیا جائے تاکہ وہ گرم پانیوں تک نہ پہنچ سکے...... اب نصب العین یہ ہے کہ کسی طرح امریکہ کو ''عراق'' اور ''افغانستان'' سے نکالا جائے۔ اور امریکہ کو ایران میں کسی جنگ کے ''بہانے'' داخل نہ ہونے دیا جائے۔ یورپ، لندن اور امریکہ میں بھی ''عراق'' کے ''حق'' میں مظاہرے ہو رہے ہیں۔

مجید نظامی نے بتایا کہ ایک بوڑھے امریکی نے جو کورین وار میں بھی لڑ چکا ہے اس نے امریکہ سے کہا ہے کہ عراق سے نکلو اور ایران مت جاؤ عجب نہیں کہ ''نژاد'' یہ جنگ لڑے بغیر جیت جائے۔ لیکن پاکستان کا رول بدقسمتی سے نائن الیون کے بعد ''جوتا اٹھانے والوں'' اور ''کفگیروں''

کا سا ہو گیا ہے۔ کہنے کو تو ہم ''ایٹمک پاور'' ہیں اور اس پاور کے لحاظ سے ایران سے ''سینئر'' اور ''سپیریئر'' بھی ہیں اور ایران کے بارے میں تو ابھی شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں، کوئی کہتا ہے وہ ایٹمی طاقت ہے، کوئی کہتا ہے کہ نہیں ہے.......... لیکن ہمارے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں ہم نے ''حتف II'' ایٹم بردار میزائل کا تجربہ کیا ہے جو دو ہزار میل تک سفر کر سکتا ہے۔ شاید اسی لئے مشرف کو بالآخر احساس ہوا ہے کہ اس کی ہر دلعزیزی امریکہ کی وجہ سے ختم ہو رہی ہے اور اقتدار بھی ختم ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تازہ ترین بیان میں انہوں نے اپنی بات میں کافی ''لچک'' کا مظاہرہ کیا ہے۔ مگر یہ ''لچک'' نائن الیون کے بعد کی ''لچک'' سے ذرا مختلف دکھائی دے رہی ہے۔

بہرحال اب اندازہ ہے کہ پاکستان میں اس حوالے سے امریکہ کی چاکری سے آزاد رہنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ مجید نظامی حقیقت پسندی کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ دراصل ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ''بے دام'' غلام بنے رہے ہیں مگر غلام بننے کے باوجود اگر بش جنگ جیت جاتا تو ہماری باری بھی آ سکتی تھی لیکن عراق کے خودکش حملے اسے مجبور کر دینگے کہ وہ عراق سے نکلے آج اس نے اچانک بغداد میں قدم رنجہ فرمایا ہے تو عراقیوں نے کم سے کم پچاس جانوں کی قربانی روزانہ دینی شروع کی ہوئی ہے۔ لیکن اور کس نے ایسی قربانیاں دی ہیں۔ دنیائے اسلام کو عراق پر قربان ہو جانا چاہئے۔ مگر خوابیدہ ملت کس طرح ایسا سوچ بھی سکتی ہے۔ افغانستان میں تو طالبان دوبارہ ''ایکٹو'' ہو چکے ہیں...... لہٰذا پاکستان اگر اپنا ''اصلی'' رول ادا کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ بش اپنا بستر گول کرنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ اسرائیل نے بش کی شہہ پر لبنان میں بھی پنگہ لے لیا ہے۔ ممکن ہے شام کو اس جنگ میں کود پڑنے کی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانا پڑے جسے روس کی سرپرستی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اس طرح اسرائیلی کھیر دلیہ بن سکتی ہے۔ لیکن یہ نوبت نہیں آئی۔ لبنان اور اسرائیل میں جنگ بندی ہو گئی یعنی اسرائیل نے جنگ فی الحال بند کر دی ہے۔ فلسطین میں میدان اسی طرح گرم ہے۔

دوست وہ ہوتا ہے کہ جس کے پاس آپ اپنی بھوک اور پیاس لے کر جا سکتے ہیں اور دوست کا کام ہے کہ وہ دوستی کے تقاضوں اور ضرورتوں کی پاسداری کا دھیان رکھے۔ پاکستان نے صدر کرزئی سمیت پچیس تیس لاکھ افغانیوں کو سالہا سال پناہ دیئے رکھی، انہیں رہائشی اور کاروباری سہولیات اور مراعات حاصل تھیں مہاجر ہو کر بھی کاروبار حیات ان کے ہاتھ میں تھا، لیکن جواباً وہاں سے ہیروئن "سمگل" ہوتی رہی اور کرزئی صاحب واقعی کارزئی بن کر غرا رہے ہیں۔ بھلا کس طرح............؟

ذرا ماضی میں جھانکیں تو معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان پہلا ملک تھا جس نے قیام پاکستان کے فوراً بعد "یو این" کی ممبر شپ کے مسئلے پر "واحد" ووٹ ہمارے خلاف ڈالا تھا۔ ہمارا پڑوسی اور اسلامی ملک ہو کر بھی وہ ہمارے خلاف گیا تھا۔ حالانکہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا اور نہ پڑا لیکن افغانستان نے اس وقت اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کر دیا......اس وقت افغانستان "ظاہر شاہ" کا افغانستان تھا۔ ہندوستان نے افغانستان کی سرزمین کو ہمیشہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا ہے......اب بھی قندھار اور جلال آباد کے قونصل خانے "را" اور "سی آئی اے" کے اڈے ہیں ...... جہاں لوگوں کو بھرتی کر کے پاکستان کے خلاف ٹریننگ دی جاتی ہے۔ مجید نظامی کہتے ہیں:

> "دراصل افغانستان وہ چھچھوندر ہے کہ نہ تھوک سکتے ہیں اور نہ نگل سکتے ہیں۔ مغرب میں بھی ایسا پڑوسی ہے جیسے مشرق کا پڑوسی بھارت جسے بدل بھی نہیں سکتے۔"

پندرھواں باب

ساڈی جان کدوں چھڈو گے؟ ضیاء الحق سے سوال

1977ء میں بھٹو کے خلاف قومی اتحاد تشکیل دیا گیا تھا کسی بھی زمانے میں کوئی گروہ ''زشت'' اور ''بد'' کے خلاف اتحاد کرتا ہے تو اپنی اشتہا اور خواہش کے جنوں کو فتح مند نہیں ہونے دیتا ہے اور اپنے اندر حق گوئی کو روشن رکھتا ہے۔ مجید نظامی نے کہا کہ اتحاد تو کرتے ہیں ڈکٹیٹر کو نکالنے کے لئے ......لیکن نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک اور سخت گیر ڈکٹیٹر کو لے آتے ہیں۔ ضیاء الحق نوے دن کے اندر اندر انتخابات کروانے کا وعدہ کر کے آ جاتا ہے اور پھر مسلط رہتا ہے......ضیاء الحق آتا ہے کہ میں ''نفاذ اسلام'' اور ''نفاذ شریعت'' کروں گا، مجلس شوریٰ کے نام پر انتخابات کو کیموفلاج کرتا ہے......اس کی اپنی Hand Picked شوریٰ تھی۔ الیکشن کے نتائج حاصل کرنیکے لئے

جن جرنیلوں کو ضیاء الحق نے ''دست و بازو'' بنا کے رکھا تھا۔ برسرِ اقتدار آ کر انہی کی ''چھٹی'' کروا دی۔ جنرل فیض علی چشتی ابھی تک اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔ انہوں نے اقتدار کے بھی بڑے مزے لوٹے اور اپنی مرضی کی صوبائی حکومتیں بھی دیکھیں۔ نواز شریف بھی ان نامزد گورنر جنرل جیلانی کی ہی ''پراڈکٹ'' ہیں۔ جس کے باس جنرل ضیاء الحق اس وقت کہا کرتے تھے کہ میری زندگی بھی اسے لگ جائے۔ اور لگ بھی گئی!

مجید نظامی گزرے ہوئے وقت کی دیواروں کے سائے میں بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔ وقت کے سمندر کی بے پایاں گہرائی میں اتر کر دن اور رات کے تمام رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ وہ ہر دور میں اپنی رائے حکمرانوں تک پہنچاتے رہے ہیں مگر اپنی ''قوت احساس'' کسی کے خانہ عقل میں نہیں ڈال سکتے تھے۔ وہ آنکھیں نہیں دے سکتے تھے جو بصیرت کے خزانے سے بھری ہوتیں۔ وہ کان نہیں دے سکتے تھے جو دلوں سے پھوٹنے والے سچ کے نغمے کی پہچان کر سکتے۔ وہ آواز نہیں دے سکتے تھے جو فضا میں بلند ہو کر ہر دل کی دھڑکن میں بجنے لگتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر انسان حکمران بن کر ایسے ہی ہو جاتا ہے۔

مگر الفاظ کے پیکر کو ہماری سماعتوں تک پہنچانے کو اپنا فرض سمجھ کر کہتے ہیں کہ جب ضیاء الحق سے میں پہلی بار ملا تھا تو وہ ململ کے کرتہ شلوار میں تھے اور اس زمانے کے حساب سے ڈھائی تین روپے کی چپل پہنے ہوئے تھے اور وردی میں تو وہ ویسے بھی نہیں ''جچتے'' تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں اقتدار کی لکیر لکھی ہوئی تھی لہٰذا اقتدار انہیں جتنے عرصے کے لئے ملنا تھا ملا رہا، لیکن وہ مسکین صورت اور ''عیار'' آدمی تھے۔ ان کی اس وقت کی ایک تصویر دیکھی جب وہ بھٹو کو حراست میں لینے کے بعد مری ملنے گئے تو گھٹنے ملا کر باوردی اور بڑے ''مودب'' انداز میں بیٹھے ہوئے تھے، بھٹو کا خیال تھا کہ اسے ''حفاظت'' میں لے لیا گیا ہے۔ حراست کا کوئی خوف اس کے ذہن میں نہیں تھا، بھٹو جیسا ''کایاں'' آدمی بھی دھوکہ کھا گیا تھا۔

ایک مرتبہ ''نوائے وقت'' نے ضیاء الحق کا گروپ انٹرویو مانگا تو کہنے لگے شرط یہ ہے

کہ مجید نظامی خود تشریف لائیں۔انٹرویو ہوتا رہا۔اچانک کہنے لگے:

آپ نے تو سوال ہی نہیں کیا......

مجید نظامی نے کہا یہ شرط نہیں تھی کہ میں بھی سوال کروں گا

تو کہنے لگے......نہیں آپ سوال کیجئے

مجید نظامی نے بڑی سادگی سے پوچھا

''ساڈی جان کدوں چھڈو گے''

ضیاء الحق کے دور پر تبصرہ کرتے ہوئے مجید نظامی اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بتاتے ہیں کہ وہ اسلام کے نام پر ''اقتدار'' پر قابض ہوئے تھے۔اسلام تو نافذ نہ ہو سکا البتہ سرکاری افسروں نے اپنے دفاتر میں مصلے بچھائے اور بغیر وضو کے نمازیں لگائیں۔

جو''خدا''انسان کو اقتدار پر قابض ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے وہی خدا''دلوں''پر بھی قابض ہونے کی قدرت رکھتا ہے۔ضیاء الحق کے ساتھ''آخری''کھانے کا ذکر کرتے ہوئے مجید نظامی نے بتایا کہ اس میٹنگ میں،میں نے ان سے سوال کیا:

یہ جو آپ انتخابات کروا رہے ہیں یہ جماعتی ہوں گے یا غیر جماعتی......؟

تو کہنے لگے......

اب تو جماعتی ہوں گے کیونکہ جونیجو صاحب موجود ہیں اور سیاسی جماعتیں آ گئی ہیں لہٰذا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انتخابات غیر جماعتی ہوں۔

اگلے دن پریس کانفرنس ہوئی تو مجید نظامی کے اسی سوال کے جواب میں کہنے لگے انتخابات''غیر جماعتی''ہوں گے

تو مجید نظامی نے پوچھا

کل رات ہی تو آپ کہہ رہے تھے کہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوں گے اور اب آپ فرما رہے ہیں''غیر جماعتی''ہوں گے۔

تو کہنے لگے۔

نظامی صاحب! میرا بس چلے تو تو پانچ انتخاب غیر جماعتی کراؤں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کی پانچ انگلیاں کھڑی کیں تو مجید نظامی نے کہا

اللہ کا شکر ہے آپ کے ہاتھ میں ''دس'' انگلیاں نہیں ہیں ورنہ آپ کہتے میں دس انتخاب غیر جماعتی کرواؤں گا۔

مجید نظامی کو گمان گزرا کہ ''پانچ'' کا مطلب پچیس سال ہیں ایک ''عشرہ'' نہیں اور اب یہ پچیس سال اور گزارنا چاہتے ہیں ...... یہ سوچ کر حاضر دماغ مجید نظامی نے کھڑے کھڑے سوال کیا

جناب! یہ آپ اپنی ''زندگی'' میں ہی کروائیں گے؟

تو ضیاء الحق ایک لمحے کے لئے پنجابی میں جو کہتے ہیں ''ٹھٹھمبر'' گئے اور کہا۔

ہاں۔! اگر اللہ نے دی۔

اس سوال جواب کے ایک ہفتہ کے بعد وہ ہوائی حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

1988ء میں منعقد ہونے والی اس پریس کانفرنس سے 34 برس پہلے کی ایک اور پریس کانفرنس کے بارے میں نومبر 1954ء کے نوائے وقت کے ایک معروف سلسلے ''سرراہے'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں تاریخ اپنے آپ کو یوں بھی دہراتی ہے۔

''پنڈت نہرو کی عمر اس وقت 65 برس ہو گئی ہے چند ہفتے قبل وہ وزارت عظمٰی سے علیحدگی کے مسئلہ پر غور فرمارہے تھے مگر جب ایک اخبار نویس نے کل پنڈت جی کو ان کی سالگرہ پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے یہی موضوع چھیڑا تو پنڈت جی کی رائے بدلی ہوئی تھی اس اخبار نویس نے یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ سو برس کی عمر تک زندہ رہنا پسند کریں گے۔ پنڈت نہرو نے اس کا یہ جواب دیا کہ اس معاملہ میں 'میں نے ابھی تک کوئی پختہ رائے قائم نہیں کی۔ لیکن میں جب تک بھی رہوں موثر رہنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ موثر رہنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ جب تک زندہ رہیں وزیراعظم رہیں۔

سولہواں باب

'میثاق جمہوریت'...... پہلا آئیڈیا مجید نظامی کا تھا

وقت کے نشیب و فراز میں آغاز و انجام، مفتوح و مغلوب، مقفل ابواب اور مسدود راستے بیکراں، گراں در گراں دکھائی دیتے ہیں...... مگر ارض و سماء کے درمیان رونما ہونے والے واقعات کا ادراک رکھنا ضروری ہے...... بلندیوں اور نشیبوں میں عکس در عکس جھانکتے ہوئے مجید نظامی بے نظیر بھٹو کے بارے میں کہتے ہیں کہ بے نظیر ''بھٹو'' کی بیٹی ہیں۔ ایک تو ''حضرت قائد اعظمؒ'' تھے جنہوں نے ملک بنایا اور جن کا انتخاب ''اقبال'' جیسے مردم شناس نے کیا تھا اور جس نے دو قومی نظریہ اجاگر کیا تھا۔ قائد اعظمؒ ان دنوں لندن میں مقیم تھے...... علامہ اقبال نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ واپس آئیں اور مسلمانوں کی رہنمائی فرمائیں...... یہ حضرت ''قائد اعظمؒ'' تھے...... اور ایک طرف ''بھٹو'' صاحب تھے جو حضرت قائد اعظمؒ کی پالیسیوں کے قریب تو نہیں

تھے مگر صرف ذرا ''نظریات'' کے قریب تھے اور وہ بھی بالکل تھوڑے...... لیکن ''قائد عوام'' ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو سر شاہنواز بھٹو کے بیٹے تھے جو سندھ کے بہت بڑے ''وڈیرے'' اور ریاست جونا گڑھ کے سابق وزیر اعظم تھے۔ بے نظیر چونکہ ''بھٹو'' کی بیٹی ہیں اور یہ بھی سمجھتی ہیں کہ میراث Inherit کی ہے...... سیاسی لیڈر شپ میرا حق ہے اور وزارت عظمیٰ بھی...... وہ یوں بھی آکسفورڈ کی فارغ التحصیل ہیں انگریزی پر عبور حاصل ہے لہٰذا انگریزوں اور امریکیوں کو قائل کر سکتی ہیں...... اور ان کی ''زبان'' میں اچھی طرح بات کر سکتی ہیں۔ بے نظیر بھٹو جب باپ کی شہادت کے بعد وزیر اعظم بنیں تو ان میں ''خو، بو'' باپ کی ہی تھی۔ دونوں بھائی تو بد قسمتی سے اللہ کو پیارے ہو گئے یا کر دیئے گئے۔ مجید نظامی کہتے ہیں جن دنوں بے نظیر بھٹو والد کے ساتھ جلسے جلوسوں میں شرکت کیا کرتی تھیں......اور اس وقت ''بچی'' تھیں۔ اتفاق سے ان کے دونوں بھائی آگے نہ آ سکے...... مرتضیٰ تو دمشق میں ہی مقیم رہا جو غنویٰ بھٹو کے شوہر تھے۔ اور فاطمہ کے والد، جو آجکل بیروت بیٹھی ہیں۔

مجید نظامی دمشق کے دورے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں جب وہ بے نظیر اور زرداری کے ہمراہ گئے ہوئے تھے۔ ان کی حافظ الاسد سے ملاقات ہونا تھی اور اس کے بعد ''لنچ'' کا انتظار تھا۔ سب لوگ انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے۔ اتنے میں مرتضیٰ کمرے میں داخل ہوئے تا کہ ''لنچ'' میں شریک ہو سکیں۔ آصف زرداری نے اشارہ کیا کہ مرتضیٰ آ کر ان کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ لیکن سب نے دیکھا کہ مرتضیٰ نے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کہیں اور جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت بھی کوئی پس منظر تھا۔ مرتضیٰ کو شاید یہ ''شادی'' پسند نہیں تھی یا کوئی اور وجہ تھی...... لیکن مرتضیٰ بعد میں کراچی میں اپنے گھر کے سامنے مارے گئے اور آصف زرداری پر مقدمہ بھی بنا۔ مجید نظامی افسردگی کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ بھٹو خاندان اس لحاظ سے بدقسمت ہے کہ عروج بھی ملا، طاقت بھی ملی لیکن ''انٹر فیملی پالیٹکس'' کی وجہ سے اس خاندان کو "Unhappiness" کے سوا کچھ نہیں مل سکا...... دراصل فطرت کے کچھ ''راز'' ہوتے ہیں

جوانسان کی سمجھ میں نہیں آسکتے جن کے سامنے جاہ وحشم اور طاقت وقوت پر چھائیوں کی طرح ڈھل جاتی ہے...... ''جاہ وجلال'' کی کرسی اور ''عزت وعظمت'' کی کرسی میں بڑا فرق ہوتا ہے...... مجید نظامی نے تسلیم کیا کہ یہ علیحدہ بات ہے کہ مادر ملت نے ایوب کا مقابلہ کر کے خواتین کے لئے پاکستان میں اقتدار اعلیٰ کے ایوانوں کے دروازے کھول دیئے لیکن بے نظیر بھٹو کو ہی یہ ''اعزاز'' جاتا ہے کہ اسلامی ملک میں ''خاتون'' ہو کر پولیٹیکل لیڈر شپ سنبھالی اور بلاشرکت غیرے حکمرانی کی۔ کیونکہ پارلیمانی سسٹم میں وزیر اعظم حکمران ہوتا ہے صدر نہیں......اور بے نظیر بھٹو کی وجہ سے ہی اسلامی پاکستان کی سیاست میں ''خاتون'' بطور سربراہ حکومت قابل قبول ہو چکی ہے اور اب بے نظیر جیسی ''بھٹوزادی'' یا مادر ملت فاطمہ جناح جیسی قابل احترام کے لئے ''دینی'' امر مانع نہیں رہا۔

مجید نظامی کہتے ہیں کہ اس لحاظ سے پاکستان ایک ''دلچسپ'' ملک ہے کہ بانی پاکستان حضرت قائداعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناحؒ نے ''تحریک پاکستان'' میں بھائی کے شانہ بشانہ حصہ لیا تھا اور بعد میں بحالی جمہوریت کی تحریک میں بھی بھرپور حصہ لیا اور جب کوئی ''مرد'' نہیں مل رہا تھا تو وہ واحد ''خاتون'' میدان میں اتریں اور ایوب جیسے ''آمر'' کا مقابلہ کیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ جیتنے کے باوجود ہار جائیں گی۔

بے نظیر بھٹو نے جب اقتدار سنبھالا تو صورتحال یہ تھی کہ ایک طرف انہیں وزیر اعظم بننے کی خوشی تھی، دوسری طرف باپ کے پھانسی چڑھنے کا غم تھا اور تیسری طرف کچھ محکمے ان کے کنٹرول میں نہیں تھے، کیونکہ وہ اک ایسے ملک کی وزیر اعظم بنی تھیں کہ جس میں اسلام نافذ کرنے کے دعوے دار بھی موجود تھے اگرچہ یہ مولانا حضرات تحریک پاکستان سے الگ بلکہ مخالف رہے اس وقت پارلیمنٹ کے اندر باہر اپنا اثر ورسوخ رکھتے تھے اور اس وقت تک مولانا حضرات ''عورت'' کی حکمرانی بھی قبول کر چکے تھے۔

مجید نظامی کہتے ہیں کہ جب بے نظیر آئی تھیں تو ان کے ساتھ آصف زرداری بھی آئے

تھے۔ابھی حال ہی میں اخبار میں ایک کارٹون چھپا ہے جس میں بے نظیر کے ہاتھ میں ''ٹھوٹھا یا کشکول'' ہے اور زرداری کی قمیض پر ''ٹن پرسینٹ'' لکھا ہوا ہے۔ زرداری بے چارے ''ٹن پرسینٹ'' لیتے تھے یا نہیں لیکن مسٹر ''ٹن پرسینٹ'' مشہور ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ''بد سے بدنام برا''...... بے نظیر کے ہی دور میں مجید نظامی ''ایڈیٹرز میٹنگ'' میں شریک تھے کہ بے نظیر آہستہ آہستہ ''پخنا'' شروع ہو گئیں۔ کیونکہ ان کے اخبار میں خبر چھپی تھی کہ بے نظیر نے کراچی کے گورنر ہاؤس میں طبیعت خراب ہونے کے باعث میٹنگ ملتوی کر دی اور ''فلاں'' نام کی گولی کھائی۔ بے نظیر کافی ''جوش'' میں تھیں...... کہتے ہیں ''عقلمند را اشارہ کافی است'' ان کے رویے سے مجید نظامی سمجھ گئے کہ یہ خبر ''نوائے وقت'' میں ہی چھپی ہو گی لہٰذا مجید نظامی کہنے لگے

محترمہ! آپ بات ختم کر چکیں......؟

بات ختم نہیں کی......بینظیر نے جواب دیا

لیکن آپ فرمائیں۔

تو مجید نظامی نے کہا

آپ بات ختم کر لیں۔

بے نظیر اصرار کرنے لگیں کہ نہیں......آپ فرمایئے۔

مجید نظامی کہنے لگے

''اگر یہ خبر غلط ہے کہ آپ نے کراچی گورنر ہاؤس میں میٹنگ "adjourn" نہیں کی تھی اور یہ گولی بھی آپ نے نہیں کھائی تھی تو رپورٹر کو تو فارغ سمجھیں لیکن ''مجھے'' یا ''اخبار'' کو جو سزا دینا چاہتی ہیں......بتا دیجئے۔

اس بات پر وہ ٹھنڈی ہو گئیں ...... جس کا مطلب یہ تھا کہ گولی کھائی تھی اور میٹنگ بھی "adjourn" کی تھی یعنی خبر سو فیصد درست تھی۔

دلوں کے صفحات پر لکھے ہوئے سوالوں کا جواب دینے والے اور سینے کے اندر لگتی ہوئی آگ کو

آرزوؤں کی شادابی عطا کرنیوالے لوگوں کی کہی ہوئی بات کیسے غلط ہو سکتی تھی ورنہ کون ہے جو ملک وقوم کی پاسبانی کے لئے غور وفکر کا ادراک رکھتا ہےاور کون ہے کہ جو اپنے صحراؤں، پہاڑوں اور دریاؤں کی گزرگاہوں کی بھی حفاظت کرنے کی بات کرتا ہے...... مجید نظامی اور ''نوائے وقت'' ہی وہ ادارے ہیں کہ جو ''اقبال'' اور ''قائد'' کی تعلیمات اور تقلیدات کے سچے محافظ ہیں۔

آصف زرداری نے بھی کئی طریقوں سے مجید نظامی سے تعلقات کی ابتدا کی۔ انہوں نے طویل جیل کاٹی تو مجید نظامی نے انہیں ''مردحر'' کا خطاب دیا۔ کئی دوستوں اور مخالفین نے نکتہ چینی کی کہ یہ آپ کس شخص کو ''مردحر'' کہہ رہے ہیں تو مجید نظامی نے کہا کہ جہاں تک جیل کے ''ریکارڈ'' کا تعلق ہے...... جو اعتراض کرتے ہیں...... آصف زرداری نے ان سے بہتر ''ریکارڈ'' دیا ہے...... آصف زرداری نے اس ''خطاب'' کے دینے کے بارے میں نیویارک سے فون کر کے کہا یہ میرے پاس زندگی کا بہترین سرٹیفکیٹ ہے...... آصف زرداری مجید نظامی سے ملنے آتے رہتے تھے۔ بے نظیر بھٹو بھی مجید نظامی کی رہائش گاہ پر تشریف لائیں اور پورے ''لاؤلشکر'' کے ساتھ آئیں، گھر کے برآمدے میں داخل ہوتے ہی مجید نظامی کی صاحبزادی کے ساتھ ''نواز شریف'' کی تصویر لگی ہوئی تھی محترمہ ٹھٹھک گئیں...... اوہو...... نواز شریف...... تو مجید نظامی نے کہا...... آپ کی تصویر بھی لگا دیں گے...... بہرحال بات مذاق میں ہی ٹل گئی حالانکہ دیواروں پر سجی ہوئی تصویروں سے بہتر تصویریں دلوں میں لگی ہوتی ہیں۔

آصف زرداری کے بارے میں مزید گفتگو کرتے ہوئے مجید نظامی کہتے ہیں اس شخص کی خوبی یہ ہے کہ اس نے رہائی کے لئے معافی نہیں مانگی۔ گرفتاری سے ایک دن پہلے آصف زرداری نے مجید نظامی کے ساتھ ان کے دفتر میں کھانا کھایا تھا...... رات گئے گورنر ہاؤس سے زرداری کا فون آیا۔ مجید نظامی نیند میں تھے۔ زرداری پنجابی میں بات کر رہے تھے کہنے لگے:

یارا کی کھانا کھوایا اے...... مینوں تے ''پھڑن'' آ گئے نیں!

جب زرداری کی پچاسویں سالگرہ منائی گئی۔ مجید نظامی نے فون کر کے مبارکباد دینا

چاہی تو زرداری کا فون آ گیا اور کہنے لگے لاہور کے یار لوگوں نے میری سالگرہ کا کیک ذرا پہلے ہی کاٹ دیا ہے۔

مجید نظامی نے بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کا ''اٹ کھڑکا'' ختم کروانے کی بھی کوشش کی تھی تا کہ ''پارلیمانی جمہوری نظام'' چلنے لگے۔ ان دنوں نواز شریف وزیراعظم تھے۔ کراچی میں ایک ملاقات میں مجید نظامی نے نواز شریف سے پوچھا...... کیا خیال ہے...... ایسا ممکن ہے کہ آپ بے نظیر کو سرکاری اپوزیشن لیڈر مان لیں اور وہی عزت و احترام دیں جو دیا جاتا ہے اور آرام سے حکومت کریں الیکشن آئے تو جو پارٹی جیت جائے وہ حکومت بنائے...... نواز شریف نے جواب دیا...... مجھے کوئی اعتراض نہیں...... بہر حال یہاں ''دو پارٹی'' سسٹم ٹھیک رہنا چاہئے۔

نواز شریف سے اجازت لے کر مجید نظامی نے عارف نظامی کے ساتھ کراچی میں محترمہ کے ساتھ بلاول ہاؤس میں ملاقات کی اور یہ ''پروپوزل'' پیش کی۔ بے نظیر نے بھی اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ جیلوں میں جاؤں اور مقدمے بھگتوں...... اگر کوئی انڈرسٹینڈنگ ہوتی ہے تو ٹھیک ہے...... لہٰذا ان کی میٹنگ ''ارینج'' ہو گئی بے نظیر نے کال کیا۔ نواز شریف بے نظیر پہ ''کال'' کرنے والا ہی تھا کہ شہباز شریف کسی وجہ سے اس ''موو'' کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے یہ بات ابا جان کے ''کان'' میں کہہ دی...... ابا جان نواز شریف سے کہنے لگے۔

کتھے جارئے او؟

نواز شریف نے کہا کراچی بے نظیر سے ملنے۔

تو اباجی کہنے لگے

وزیراعظم ''توں'' اے کہ او؟ اسے تمہیں ملنا چاہئے۔

نواز شریف اباجی کے سامنے ''پر'' نہیں مار سکتے تھے بحث کی ہمت و جرأت کہاں سے لاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اباجی اگر کہہ دیں کہ وزارت عظمیٰ چھوڑ کر گھر آ جاؤ تو ایک لمحہ نہ سوچوں اور

فوراً استعفیٰ دیکر گھر آ جاؤں۔ لہٰذا ٹرین پٹڑی سے اتر گئی۔ لیکن اس وقت تک بے نظیر بطور اپوزیشن لیڈر سرکاری خرچے پر لندن میں ایام زچگی گزار آئی تھیں۔ یہ ''پہلا ایڈیشن'' تھا میثاق جمہوریت کا۔ اگر شہباز شریف اور مرحوم اباجی نواز شریف کو آزادانہ سیاست اور حکومت کرنے دیتے تو شاید آج پاکستان میں دو پارٹی سسٹم کامیابی سے چل رہا ہوتا۔ مجید نظامی کا کہنا ہے کہ اب ''وہی'' سارا سلسلہ لندن میں چل رہا ہے اور شہباز شریف اس پروگرام کا حصہ ہیں۔

خدا کرے کہ ٹرین اب پٹڑی پر چل پڑے...... کیونکہ تمام سیاسی پارٹیوں کو اکٹھا ہو کر یہ عہد کرنا چاہئے کہ سیاست کرنے کے لئے ''فوج'' کا سہارا نہیں لیں گے، کیونکہ بھارت ایسے ازلی دشمن سے واسطہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے فوج کا کام سرحدوں کی حفاظت ہے اور سیاسی لیڈروں نے ملکوں اور قوموں کی تاریخ مرتب کرنا ہوتی ہے...... انسان فانی ہے اور وہ ''بیج'' کی طرح مٹی کی فصل میں بو دیا جاتا ہے مگر گزرے ہوئے وقت میں ہوائیں اور موسم نئی نئی فصلیں اگا دیتے ہیں ...... مسمار ہو جانے والے انسانوں کی داستانیں اور قوموں کے وقار اور عروج و زوال کی کہانیاں تاریخ کا حصہ بننے والے سنہری ''حروف'' سنایا کرتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق ہر آنے والی شب ظلمت بداماں میں روشنی کی کرنوں کی طرح جگمگاتے ہیں اور آنے والے نئے لوگوں کو راستہ دکھاتے ہیں...... لہٰذا سوچنا ہوگا کہ ہمیں ''کردار'' کی عظمت کی کون سی داستان چھوڑنی ہے کہ جو منزلوں کی طرف جانے والے راستوں سے باخبر کر سکے۔

سترھواں باب

وزیراعظم جارہے ہیں......میں قائم ہوں: نواز شریف

دنیا میں ہر سیلف میڈ آدمی کا سفر ''بے بال و پر'' شروع ہوتا ہے۔ ہر گام تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے ہجوم پریشانی بھی ستاتا ہے اور ناامیدی کا حصار بھی گھیرے رکھتا ہے مگر منزل کی طرف اٹھتے ہوئے قدموں کی راہبری حیات کی طویل گھاٹیوں کو عبور کرانے میں مددگار ہوتی ہے۔ پرخطر راستے بے معنی دکھائی دیتے ہیں اور پیچیدہ شاہراہوں پر بکھرے ہوئے برگ خزاں رسیدہ کی جگہ کیف آفریں بہار اپنی رعنائیوں کے ساتھ کل عالم دکھائی دیتی ہے اور انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کی وجہ سے شاد شاد اور مسرور رہتا ہے۔

نواز شریف کا پس منظر یہ ہے کہ ان کے والد سیلف میڈ آدمی تھے۔ میاں شریف پاکستان بننے سے پہلے امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے تھے ریلوے روڈ کے قریب واقع

لوہے کے کارخانے ''اتفاق'' کے نزدیک ہی انہوں نے رہائش بھی اختیار کی اور کاروبار کا آغاز بھی کیا لیکن کاروبار کے وسعت اختیار کر جانے کے بعد ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن میں آ گئے جہاں انہوں نے ایک ہی قطار میں سات کوٹھیاں بنوائیں۔ ان میں چھ باقی بھائیوں کے لئے اور ایک ان کی اپنی رہائش کے لئے تھی میاں صاحب نے بچوں کو پڑھایا لکھایا۔ نواز شریف نے ایل ایل بی اور شہباز شریف نے گریجویشن تک تعلیم مکمل کی۔

میاں شریف، نواز شریف اور شہباز شریف کو اس لئے بھی مشورے دیتے رہتے تھے کہ وہ ایک بڑے خاندان کے ''ہیڈ آف دی فیملی'' ہونے کی وجہ سے اور کاروبار کے چیئرمین کی حیثیت سے اچھے ایڈمنسٹریٹر'' تھے۔ وہ پورے خاندان کے ''چیئرمین'' تھے اور ''چیئرمین'' کہلاتے تھے۔ میاں صاحب بھائیوں میں درمیان میں آتے تھے لیکن اپنے سے بڑے بھائیوں پر بھی ان کا پورا کنٹرول تھا۔ میاں شریف محنتی انسان تھے ''اتفاق فاؤنڈری'' انہوں نے اپنے زور بازو سے بنائی تھی لیکن اتنی ترقی کے باوجود میاں گھرانے کی نشست و برخاست ''پنجابی'' اور ''مشرقی'' سٹائل کی تھی۔ مجید نظامی نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا مگر سنا ہے کہ وہ باورچی خانہ میں بیٹھ کر عادتاً یا روایتاً کھانا کھایا کرتے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں جب انہوں نے ''نیشنلائزیشن'' کی تو اس میں اتفاق سے ''اتفاق انڈسٹری'' بھی شامل تھی اور یہی بات ''میاں'' فیملی کو سیاست میں لے آئی کیونکہ میاں صاحب اپنے سنہرے خوابوں کو ماضی کے دھندلکے میں روپوش ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ بہ یک جنبش کاتب تقدیر انہیں مائل بہ حسرت کر دے۔ وہ اپنے خوش آئندہ خواب میں کوئی پردرد باب تحریر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے وہ کامیابی حاصل کی تھی کہ جو اس دہر میں کمیاب اور سایہ ہما جیسی نایاب تھی...... مگر مقدر کا لکھا سارے پرندے اڑا دیا کرتا ہے۔ بدقسمتی سے میاں شریف نے آخری عمر میں جلاوطنی کا دکھ بھی برداشت کیا۔

مجید نظامی کے ساتھ رابطہ میاں شریف نے بھٹو کی ''نیشنلائزیشن'' کے بعد کیا تھا۔ میاں

صاحب کے جرنیلوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ ان میں جنرل اقبال اور جنرل جیلانی دو نمایاں جرنیل تھے جن سے آہستہ آہستہ میاں صاحب نے خاصی قربت حاصل کر لی تھی۔

جنرل جیلانی جب گورنر پنجاب ہوئے تو انہیں ''کیبنٹ'' بنانے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے نواز شریف کو اپنا ''وزیر'' بنایا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ شہباز شریف کو وزیر بنانا چاہتے تھے لیکن میاں شریف کا خیال تھا کہ نواز شریف ان کا بڑا بیٹا ہے لہٰذا یہ حق اسی کو ملنا چاہئے۔ لہٰذا نواز شریف آئے اور پھر سیاست میں ترقی کرتے چلے گئے۔ پہلے ''صوبائی وزیر خزانہ'' پھر ''وزیر اعلیٰ'' اور پھر ''وزیر اعظم'' بن کر مسند اقتدار پر جلوہ افروز ہوتے چلے گئے۔ شہباز شریف بھی وزیر اعلیٰ بنے۔ لوگ شہباز شریف کو ''گڈ گورننس'' کی وجہ سے زیادہ بہتر لیڈر تصور کرتے ہیں۔

شہباز ذرا سخت زبان بھی تھے لیکن فضاؤں میں اڑتے ہی رہنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے ضروری بھی ہے کہ وہ کسی کے پر فریب جال میں گرفتار نہ ہوں چھت سے ٹکرانے سے بچنے کے لئے سر کو جھکانا اور کسی کے گرنے سر پر آنے والے پتھر کا شعور حاصل کرنا ہی عقل مندی ہو سکتا ہے لیکن شہباز شریف کی ''شادیوں'' کا مسئلہ رہا ہے کسی زمانے میں غلام مصطفیٰ کھر کی تیسری بیوی تہمینہ کھر نے ''مائی فیوڈل لارڈ'' لکھی تھی جو کھر کے بارے میں تھی۔ اب ''مائی انڈسٹریل لارڈ'' کی توقع بھی کرنی چاہئے۔ تہمینہ کھر کو مجید نظامی اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ کرنل درانی کی بیٹی ہوا کرتی تھیں۔ اتفاق سے شہباز کی دو نمبر ''وائف'' کو بھی مجید نظامی اچھی طرح جانتے تھے۔ مجید نظامی نے بتایا کہ میری رہائش گاہ کے اسی کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک دن میں نے شہباز سے پوچھا۔

سنا ہے دوسری شادی کر لی ہے؟

تو جواباً ''ہاں'' کہہ دیا۔

مجید نظامی نے کہا

کر لی ہے تو اب چھوڑ دیں۔

تو کہنے لگے

اباجی نے کہا تھا۔

مجید نظامی نے جواب دیا۔

نہیں ''چچا جان'' کہہ رہے ہیں کہ چھوڑ دیجئے۔

اور پھر انہیں کچھ باتوں کا پس منظر بتایا۔ دراصل اچھا دوست بھی طبیب کی طرح ہوتا ہے اس پر بھروسہ کر کے اس کی دی ہوئی دوا کو خاموشی سے پی لینا چاہیے خواہ اس وقت وہ کڑوی بھی لگ رہی ہو ایسا دوست بیک وقت ''دور'' اور ''نزدیک'' ہوتا ہے اور سماعت اور بصارت سے ماوراالفاظ کی حقیقتوں کو جان رہا ہوتا ہے اور یہی وہ روشنی ہوتی ہے کہ جس کے سہارے جادہ حیات پر گامزن رہنے کی مردم شناسی کی قندیلیں روشن رہتی ہیں اور آنے والے اندھیروں سے باخبر رکھتی ہیں۔

جن دنوں شہباز شریف وزیراعلیٰ اور نواز شریف وزیراعظم تھے مجید نظامی نے میاں شریف کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ......اب آپ انڈسٹری کے اور یونٹ لگانا چھوڑ دیں......تو بڑے میاں صاحب حیران رہ گئے اور بولے......تو پھر میں کیا کروں...... مجید نظامی نے کہا کہ خاندانی جھگڑوں کو نبٹانے کے لئے ''بندر بانٹ'' کر دیجئے......میاں صاحب پھر کہنے لگے...... ''آپ عجیب بات کر رہے ہیں......کہ جو ہے وہ بانٹ دوں اور مزید یونٹ بھی نہ لگاؤں''...... انہیں اس وقت یہ مشورہ بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا کہنے لگے......''مجھے تو بینکرز گھر آ کر قرضہ دیتے ہیں کیونکہ ہم اچھی کاروباری پارٹی ہیں''۔ مجید نظامی نے کہا......قرضہ دینا اور انٹرسٹ لینا تو بنکوں کا کام ہے اب جبکہ آپکے دو بیٹے اقتدار میں ہیں اور آپ ''لائم لائٹ'' میں ہیں تو لوگ سمجھیں گے کہ آپ کو یہ سہولیات اقتدار میں ہونے کی وجہ سے مل رہی ہیں۔ اتفاق سے مجید نظامی اور میاں شریف کے مشترکہ دوست Lloyds Bank کے منیجر احمد نذیر خان تھے......اس بات کے بعد ایک دن وہ خصوصی طور پر مجید نظامی سے ملنے کے لئے آئے اور یہ بتانے کے لئے بھی کہ میاں صاحب بہت اچھی پارٹی ہیں اور ہم انہیں کامیاب صنعت کار ہونے کی وجہ سے ''فارن''

بنک ہونے کے باوجود قرضہ دینا اعزاز سمجھتے ہیں۔

اصل وجہ یہ تھی کہ نواز، شہباز کی سیاست میں آمد کے بعد کامیابی اور حصول اقتدار کی وجہ سے ان کے لاتعداد کزن جیلس ہو گئے تھے اور وہ اتفاق گروپ کی بندر بانٹ بھی چاہتے تھے۔ بندر بانٹ ہو گئی لیکن اس کے بعد وہ رقابت اور بڑھ گئی۔ اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ نوابزادہ نصراللہ خاں ایسے سینئر سیاستدان نے اسے ایکسپلائٹ کرنے کی کوشش بھی کی۔

مجید نظامی کے دوستانہ مشوروں کے باوجود میاں صاحب نے شوگر ملوں سمیت اور بھی یونٹ لگائے۔ جو ابھی تک اس خاندان کے پاس ہیں، لیکن اب نواز، شہباز میں بندر بانٹ ہو چکی ہے اور چھوٹے اور تیسرے بھائی، بھائی جان نواز کے پلڑے میں ہیں۔ جہاں تک ذاتی طور پر اس خاندان کی عزت کرنے کا سوال ہے مجید نظامی کہتے ہیں کہ یہ خاندان مشرقی روایات اور اخلاقیات کا نمونہ ہے اور خاندان کے تمام افراد ہی نماز روزہ کے پابند ہیں۔

مجید نظامی آوازوں کی اس بازگشت کو لفظوں کا پیرہن دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وزیراعظم جونیجو کے دور میں نواز شریف پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے۔ مجید نظامی کے جونیجو سے بہت اچھے تعلقات تھے...... جونیجو مجید نظامی کے لئے ''قائد'' کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے جبکہ مجید نظامی سمجھاتے رہتے تھے کہ وہ ایک ہی ''قائد'' کو جانتے ہیں اور وہ ہیں ''قائداعظم''...... مجید نظامی کئی مرتبہ جونیجو کی رہائش گاہ پر اسلام آباد اور کراچی گئے اور کھانے میں ہاتھ کی بنی ہوئی یعنی توے کی روٹیاں کھائیں۔ مجید نظامی کھانے پینے میں خاصے پرہیزی ہیں مگر جونیجو کے گھر کے ہلکے پھلکے ''پھلکے'' شوق سے کھاتے رہے۔

جونیجو پاکستان کی تاریخ کے سب سے زیادہ شریف النفس اور پاکستان کی دولت کو اپنی دولت نہ سمجھنے والے وزیراعظم تھے بطور وزیراعظم انہوں نے جرنیلوں سمیت افسر شاہی کو سوزوکی میں بیٹھنے کی کوشش کی اور اسٹیبلشمنٹ کو اپنا دشمن بنالیا۔ انہوں نے آخری غیر ملکی ٹور جاپان کا کیا تھا جس میں مجید نظامی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ آخری رات کو ہوٹل کے کمرے میں مجید نظامی کو جونیجو کا

فون آیا...... وہ کہہ رہے تھے ...... سائیں ہم باقی ٹور کینسل کر رہے ہیں صبح واپسی کی تیاری کریں...... مجید نظامی جو اقتدار کی کشمکش سے بخوبی آگاہ تھے فوراً اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ Coup d'etat ہو چکا ہے اور صدر ضیاء الحق انہیں ''ڈس مس'' کر چکے ہیں۔ واپسی پر جب اسلام آباد ائیر پورٹ پر اترے تو اس وقت کے وزیر اطلاعات و نشریات قاضی عابد کافی دیر تک مجید نظامی کے پاس لاؤنج میں بیٹھے رہے کیونکہ لاہور جانے کے لئے اگلی فلائٹ کا انتظار تھا۔ مجید نظامی کی قاضی عابد سے خاصی دوستی تھی وہ ساری کہانی سناتے رہے کہ کس طرح اور کیا ہوا...... جاپان کے اس ٹور میں نواز شریف بطور وزیر اعلیٰ شریک تھے لیکن اس وقت ائیر پورٹ پر موجود نہیں تھے۔ لاہور کی پرواز میں مجید نظامی بیٹھے ہوئے تھے کہ نواز شریف جہاز میں تشریف لے آئے اور ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے کہا:

میں نظامی صاحب کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا وہ ان کے ساتھ سیٹ بدل لیں۔

نواز شریف مجید نظامی کے ساتھ بیٹھتے ہی کہنے لگے۔

''خبر'' سن لی ہے۔

مجید نظامی نے کہا۔

ہاں سن لی ہے۔

اور پوچھا:

آپ کہاں چلے گئے تھے؟

تو نواز شریف کہنے لگے:

''میں صدر ضیاء الحق کی طرف چلا گیا تھا...... ''وزیر اعظم'' جا رہے ہیں جبکہ میں ''قائم'' ہوں''۔

مجید نظامی نے کہا ''مجھے پتہ چل گیا ہے''۔

راستے میں گپ شپ ہوتی رہی۔ مجید نظامی نے کہا: ''اگر آپ سیاسی لیڈر بننا چاہتے ہیں تو بے شک یہ ایکسٹینشن آپ کو ضیاء کی وجہ سے ملی ہے لیکن اب آپ لاہور ائیر پورٹ پر اتر کر

پریس کانفرنس میں بات کریں اور کہیں کہ میرا وزیراعظم ڈس مس کر دیا گیا ہے لہٰذا میں بھی بطور وزیراعلیٰ استعفیٰ دے رہا ہوں"۔

تو کہنے لگے:

"مینوں مرواؤ گے جی!...... کیونکہ وزارت اعلیٰ قائم ہے استعفیٰ دوں اور جیل جاؤں؟"

مجید نظامی کہتے ہیں کہ بعد میں نواز شریف نے ضیاء الحق کے کاندھے ٹھیک طرح سے استعمال کئے اور ترقی بھی کی لیکن اب وہی نواز شریف ایک فوجی جرنیل سے مات کھانے کے بعد ان چیزوں کے قائل ہوئے ہیں جو پہلے کرنی چاہئے تھیں۔اب وہ بے نظیر کے ساتھ مل کر میثاق جمہوریت کے داعی بن کر میدان سیاست میں ازسرنو اترے ہیں اور ساری کسر نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں......رہے نام اللہ کا!

بہر حال انسان آہستہ آہستہ سیکھتا ہے۔اب وہ لوگوں کو یہ یقین بھی دلا رہے ہیں کہ جمہوریت کی "اصل" شکل برقرار رکھیں گے......لیکن حالات ایسے ہیں کہ اس "کاٹھ کی ہنڈیا" کے پکنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ادھر چودھری پرویز الٰہی خواہش مند ہیں کہ وہ ترقی کرتے کرتے نواز شریف کی طرح وزیراعظم بن جائیں۔چودھری برادران میاں نواز شریف کے سیاسی ساتھی تھے ابتدا میں بغاوت چودھری پرویز نے کی تھی اور بیچ بچاؤ چودھری شجاعت کراتے رہے تھے۔ایک وقت تھا کہ چودھری شجاعت بھی مجید نظامی سے ملنے آئے کہ آپ جدہ جا کر ایک عمرہ اور کر لیں اور مسلم لیگ کو بھی ایک کر دیں۔ان کا مطلب تھا کہ جدہ جا کر نواز شریف سے بات چیت کریں تو مجید نظامی نے کہا

پہلے "باس" سے بات کریں اور رضامندی حاصل کریں۔

جب مجید نظامی اگلے عمرے پر جانے لگے تو "باس" نے مجید نظامی کو ایوان صدر بلا کر یاد دلایا کہ چودھری شجاعت کے ساتھ کیا بات ہوئی تھی، اب آپ عمرے پر جا رہے ہیں تو "ملاقات" تو ہو گی، جائیں اور مسلم لیگ کو ایک کریں......لیکن انہوں نے کوئی پیغام، کوئی پروگرام

یا تجویز پیش نہیں کی تھی لہٰذا مجید نظامی نے کہا کہ وہ مسلم لیگ (ن) آپ کو "پلیٹ" میں رکھ کر پیش نہیں کر دیں گے آپ کوئی تجویز نہیں دے رہے لہٰذا مجھے کوئی امید نہیں ہے۔ البتہ ملاقات ہوئی تو میں کہہ دوں گا تو انہوں نے کہا جو بات "وہ" کریں مجھ تک پہنچا دیجئے گا۔ جدہ میں مجید نظامی کی نواز شریف سے "لیگ" کو ایک کرنے کی بات ہوئی تو پہلے وہ کہنے لگے

تسی ساڈے نال مذاق کر دے او۔

مجید نظامی نے کہا

نہیں یہ مذاق نہیں ہے۔

تو پھر کہنے لگے

یہ تو ڈیل ہوئی نا۔

مجید نظامی نے کہا

ڈیل تو وہ تھی کہ جس کے تحت وہ "سرور پیلس جدہ" میں "سرور" لے رہے ہیں اور شاہی مہمان بنے ہوئے ہیں۔

جواباً وہ کہنے لگے

نہیں......جی!

لیکن کسی نہ کسی انڈرسٹینڈنگ کے باعث ہی وہ "وہاں" پر قیام پذیر تھے اور دس سال کے لئے ملک بدر بھی تھے۔ لیکن اب ایسی صورتحال پیدا ہو چکی ہے کہ جنرل مشرف کے ہوتے ہوئے ان کا آنا کٹھن ترین راستہ ہے لیکن اس معاملے میں بے نظیر کا معاملہ الگ ہے، وہ زیادہ قابل قبول ہو سکتی ہیں اور وہ امریکہ کے لئے بھی قابل قبول ہیں کیونکہ مشرف اور بے نظیر کا "ایجنڈا" ملتا جلتا ہے جو بش کو بھی قابل قبول ہے۔ البتہ نواز شریف کا ایجنڈا مختلف ہے۔ نواز شریف اسلامائزیشن، پاکستانیت اور اسلامی فلاحی مملکت کے "خلیفہ" بننے کے آرزومند رہیں۔ یوں بھی خلیفہ کے پاس ہی اختیارات ہوتے ہیں جبکہ شوریٰ برائے نام ہوتی ہے......اگر مشرف

وردی اتار دیں تو بینظیر شاید وزیر اعظم بننے پر تیار ہو جائیں...... ''میثاق جمہوریت'' پر دستخط کرنے کے باوجود...... مجید نظامی کہتے ہیں خدا کرے میری یہ رائے غلط ثابت ہو اور بے نظیر اور نواز شریف ''میثاق جمہوریت'' پر مشترکہ جدوجہد کے لئے ثابت قدم رہیں اور اکٹھے پاکستان آئیں۔

مجید نظامی کہتے ہیں کہ جنرل مشرف نے شہباز شریف کی تعریف کی اور انہیں Good Administrator قرار دیتے ہوئے ان کی گڈ گورننس کی بھی تعریف کی اور کہا کہ وہ الیکشن کے بعد واپس آ سکتے ہیں تو مجید نظامی نے کہا...... وہ الیکشن کے بعد آ کر کیا کریں گے بلکہ تماشہ بنیں گے......

تو کہنے لگے...... پھر آپ تماشہ دیکھئے گا......

تو مجید نظامی نے کہا کہ داشتہ آید بکار......

تو ہنس کر کہنے لگے کچھ سمجھ لیں ...... البتہ نواز شریف کو Freedom of Movement ہو گی کہ وہ نیویارک جائیں، لندن جائیں، برگر کھائیں یا پیزا کھائیں یعنی جہاں چاہیں جا سکتے ہیں یعنی فریڈم آف موومنٹ!

کم و بیش جدہ میں نواز شریف نے تو اس مسئلے پر بات چیت کرنے سے انکار کر دیا تھا البتہ شہباز شریف تیار تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان کی بات چیت چل رہی ہے اور گورنمنٹ سے رابطے میں ہیں۔

مجید نظامی نے واپس آ کر ''باس'' کو ساری بات بتائی تو وہ ناراض ہو گئے کہ آپ خود نہیں چاہتے ورنہ سب کہتے ہیں کہ آپ کے ذریعے ''لیگ'' کو اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔

نواز شریف مجید نظامی کے ساتھ تعلقات ضروری سمجھتے تھے اور مجید نظامی کو عزت و احترام دیتے تھے۔ مجید نظامی کہتے ہیں کہ میرا قیاس غلط بھی ہو سکتا ہے کہ شاید یہ ایک مجبوری تھی جو اپنے ''اباجی'' کی وجہ سے انہیں نبھانا پڑتی تھی لیکن جب رفیق تارڑ کو صدر بنایا گیا تو ان دنوں نواز شریف اباجی کے ساتھ مجید نظامی کے پاس آئے تھے اور آفر کی تھی کہ آپ صدر بن جائیں تو مجید

نظامی نے کہا:

شکریہ! یہ میرا کام نہیں ہے اور شاید اس طرح آپ مجھے اس "کرسیٔ ادارت" سے فارغ کر کے "کرسیٔ صدارت" پر بٹھانا چاہتے ہیں لیکن میں اپنا کام کرنا چاہتا ہوں اور جس کرسی پر بیٹھا ہوں اپنے لئے اسے ہی سب سے زیادہ قابل عزت اور احترام سمجھتا ہوں۔

تمکنت اور وقار کے تخت پر جلوہ افروز مجید نظامی لوگوں کے دلوں میں تکریم و تعظیم کے ستونوں سے آراستہ اس طلسماتی دائرے میں سانس لیتے ہیں کہ جہاں وفاداری اور محبت کا تاج ان کے سر پر جگمگا تا رہتا ہے اور یہ وہ سعادت ہے کہ جو حرص و ہوس سے سجے ہوئے اقتدار کے تخت کو ٹھکرا کر حاصل ہو سکتی تھی۔

تُو اے حاضر شب خود چراغ بن اپنا

اٹھارہواں باب

ایدا اگّا پچّھا کوئی نمیں ...... میاں شریف کی غلط فہمی

مجید نظامی اپنی سوچوں کے آسمان، وادیوں اور میدانوں میں بکھری ہوئی باتوں کے ڈھیر کو یادوں کی ہواؤں سے کریدتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہیں منگلا میں ایک لیکچر دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ کم گو مجید نظامی کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے باغیانہ افکار ان کے دل کے سمندر میں طغیانی برپا کرتے رہتے ہیں اور دامن کو بھگوتے رہتے ہیں مگر چہرے کے اتار چڑھاؤ اور زبان کی نوک تک آنے کی جرأت نہیں کرتے لہٰذا وہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ بات نہیں کرتے البتہ سوال جواب کا ''سیشن'' انہیں پسند آتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد مجید نظامی کو پتہ چلا کہ پرویز مشرف اس وقت کور کمانڈر منگلا تھے۔ جن دنوں وہ لیکچر کے لئے منگلا گئے تھے...... کچھ دنوں بعد اچانک خبر ملی کہ انہیں چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا ہے اور یہ انتخاب out of merit اور out of

turn ہے۔مجید نظامی نے نواز شریف اور میاں صاحب سے پوچھا۔

یہ آپ کہاں سے لے آئے ہیں؟ Stranger in the house

تو میاں صاحب کہنے لگے۔

اِدا اگا پچھا کوئی نمیں۔

تو مجید نظامی نے کہا

دراصل یہ آپ کی غلط فہمی ہے......فوج میں ''سردار'' ہوتا ہے اور فوج سردار کی سرداری کو مانتی ہے لہٰذا یہ نہ کہیے کہ ''آ گا پچھا'' کوئی نہیں۔

اس کے بعد سب نے دیکھا کہ پرویز مشرف نے Coup d'etat کیا اور وہ جیت گیا...... بعد میں پرویز مشرف نے خود بتایا کہ ''جب میں سری لنکا جا رہا تھا تو میں نے کہا...... کسی اور شخص کو بھیجیں کیونکہ یہ میرے ''رینک'' کی کانفرنس نہیں ہے''

پرویز مشرف نے بتایا:

''کیونکہ میرا انٹیلی جنس پر مکمل ہولڈ تھا اور مجھے اطلاع مل رہی تھی کہ میرے بارے میں ''ارادے'' یا ''رویے'' ٹھیک نہیں ہیں......لہٰذا میں نے اپنے ساتھ کافی سارے پستول رکھ لیے تھے......واپسی پر جب Coup d'etat کیا گیا تو اس وقت تک جنرل بٹ کے لئے ''بیجز'' بھی لنڈے سے خریدے جا چکے تھے۔لہٰذا میرے جہاز کو لینڈ نہیں کرنے دیا جا رہا تھا......اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے مارنا چاہتے تھے تا کہ جہاز میں تیل ختم ہو جائے اور جہاز ائیر پورٹ تک نہ جا سکے

"By the way...... I was in touch

with my uniform fellows!"

بہرحال یہ ''کو'' تھا یا ''کونٹر کو'' وہی جیتا۔جس نے جیتنا تھا۔نواز شریف بھٹو سے خوش قسمت نکلے کہ جان بچ گئی اور جیل سے سیدھے سرور پیلس جدہ پہنچ گئے جسے انہوں نے اللہ کے گھر

پہنچ جانے کے مترادف قرار دیا۔

مجید نظامی کہتے ہیں نائن الیون کے بعد پرویز مشرف نے ایڈیٹرز کو بریفنگ کے لئے بلایا۔ انہوں نے کوشش کی کہ مجید نظامی کے ساتھ تعلقات اچھے رہیں وہ مجید نظامی کو اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا کر ''پروٹوکول'' دیتے تھے اس دن بھی پاکستان بھر کے ایڈیٹرز کا اجتماع تھا...... مجید نظامی کے سوال نہ پوچھنے پر ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے...... آپ اپنی رائے نہیں دے رہے ہیں...... مجید نظامی نے جواب دیا...... میری رائے رہنے دیں...... تو اصرار کرنے لگے...... کہ نہیں آپ بتائیے تو مجید نظامی نے کہا...... جنرل صاحب...... فوجی معنوں میں بات کر رہا ہوں...... آپ نے ''بش'' نہیں ''پاؤل'' کی ایک کال پر سرینڈر کر دیا...... مجید نظامی کے اس جواب پر ''چیف'' گرمی کھانے لگے لہٰذا پوچھا......

آپ ہوتے تو کیا کرتے؟

میں کیوں ہوتا؟...... مجید نظامی نے جواب دیا...... میں اپنا کام کر رہا ہوں...... اگر آپ بھی اپنا کام کر رہے ہوتے تو یہ مشکل پیش نہ آتی...... اس جواب پر وہ اور ''تاؤ'' میں آ گئے اور بولے

نہیں...... فرض کیجئے آپ ہیں...... تو کیا بات کرتے؟

جناب! اگر آپ نے ضرور ہی سننا ہے...... تو میں ''ٹائم'' گین کرتا...... اور میں ''پاول'' سے کہتا آپ کو کیا پتہ ہے کہ آدھی رات کو اس وقت میں کس حالت میں ہوں...... ہال بھی مسکرایا ......اور خود بھی مسکرائے...... مجید نظامی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا...... اور میں کہتا...... دن ہو لینے دیجئے...... اس وقت میری کیبنٹ ہے اور نہ اسمبلی...... کچھ ذاتی دوست ہیں...... کچھ دوست ممالک بھی ہیں...... چین، سعودیہ، انڈونیشیا، ملائشیا اور دو چار اسلامی ممالک سے بات کروں گا ......او آئی سی ہے اس کا اجلاس بلا کر مشورہ کروں گا...... آپ میرے کاندھے پر اتنا ہی بوجھ ڈالیں کہ جتنا میں اٹھا سکوں...... لیکن آپ نے تو فوراً "yes sir" کہہ دیا۔

جنرل مشرف نے مجید نظامی کی باتیں سن کر میٹنگ ختم کر دی۔ مجید نظامی جب کمرے سے باہر نکلے تو طارق عزیز ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ کہنے لگے

نظامی صاحب! آپ ہمارے پریذیڈنٹ سے کیسی باتیں کر رہے تھے؟

مجید نظامی نے پوچھا

آپ کون ذات شریف ہیں؟

طارق عزیز نے جواب دیا

آپ مجھے نہیں جانتے' میں طارق عزیز ہوں۔

تو مجید نظامی نے کہا

میں تو آپ کو نہیں جانتا۔

اس کے بعد مجید نظامی اور ''چیف'' کا رابطہ ختم ہو گیا اور مجید نظامی اس کے بعد ان کی کسی میٹنگ یا بریفنگ میں نہیں بلائے گئے۔ ایک مرتبہ انہوں نے عارف نظامی کو بلا کر کہا......

He is an arrogant person اب میں کسی میٹنگ میں انہیں نہیں بلاؤں گا تو عارف نظامی نے کہا...... انہیں فرق نہیں پڑتا...... لہٰذا اس دن کے بعد بقول مجید نظامی نہ انہوں نے ''مس'' کیا اور نہ میں نے ''مس'' کیا...... کتنی عظمت ما ٓب ہے سچائی......

مجید نظامی کہتے ہیں کہ کچھ دن پہلے ٹی وی پر صدر محترم کی فیملی ڈسکشن کے حوالے سے ماریانہ بابر کا تبصرہ پڑھ رہا تھا...... وہ کہتی ہیں کہ شاھد بیٹا کہہ رہا ہے کہ وردی نہ اتاروں جبکہ بیٹی کہہ رہی ہے وردی اتار دوں...... اس بات پر مجید نظامی کو ''کاکڑ'' صاحب یاد آ گئے نواز شریف سے جب انہوں نے استعفیٰ مانگا تو نواز شریف شام کو مجید نظامی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ جنرل (ر) مجید ملک سمیت آٹھ دس ساتھی بھی تھے۔ نواز شریف کہنے لگے...... مجھ سے کمانڈر انچیف نے استعفیٰ مانگا ہے۔ مجید نظامی نے میاں نواز شریف کو برآمدے میں پڑا ہوا کارڈلیس فون اٹھا کر دیا اور کہا...... انہیں فون کریں اور کہیں

Nothing doing I am the Chief Exective! مسئلہ حل ہو جائے گا۔ نواز شریف مجید نظامی کے دفتری کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے...... میں ادھر جا کر بات کرتا ہوں...... وہ کچھ دیر بعد واپس آئے تو کہنے لگے مجھے مڈ نائٹ تک کا ٹائم ملا تھا تو میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں کل بتاؤں گا۔ مجید نظامی نے فوراً کہا...... میاں صاحب! خدا حافظ...... you are no more PM...... چنانچہ اگلی صبح ان کی چھٹی ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد کاکڑ صاحب نے جی ایچ کیو میں کسی بہانے سے کچھ ایڈیٹرز کو بلایا ان میں مجید نظامی بھی شامل تھے ''جنگ'' اور ''نیشن'' کے ایڈیٹرز کے علاوہ مجیب الرحمٰن شامی بھی موجود تھے۔ کاکڑ صاحب بیٹھتے ہی کہنے لگے:

میں اس ایڈیٹر سے ملنا چاہتا تھا جس نے کہا تھا

Nothing doing I am the Chief Executive

مجید نظامی نے بے دھڑک کہا

مجھ سے ملیے یہ میں نے ہی کہا تھا

لہٰذا انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس کے بعد کیا کریں۔

مجید نظامی نے فوراً سوال کر دیا کہ سر! آپ ایکسٹینشن لے رہے ہیں؟

کہنے لگے

میں لوں یا نہ لوں...... یہ مجھ پر مسلط کی جا رہی ہے

تو مجید نظامی نے کہا

ہمارے بہادر چیف پر کوئی چیز مسلط ہو سکتی ہے آپ کے اسی میز پر بیٹھے ہوئے دس کے لگ بھگ افسران اعلیٰ منتظر ہیں کہ آپ باعزت بروقت ریٹائر ہوں اور ان کی ترقیاں ہوں۔ وہاں پر اس وقت جنرل جہانگیر کرامت، جنرل علی قلی اور کئی بڑے بڑے ''ٹاپ براس'' تشریف فرما تھے اور باہر سینکڑوں کی تعداد میں منتظر ہیں کہ ان کی ترقی ہو تو ان کی پروموشن ہو۔ جنرل صاحب باتھ

روم گئے پھر واپس آ گئے کہنے لگے نظامی صاحب! تھوڑا اندر چل کر گپ شپ کر لیں۔

کانفرنس روم سے اپنے کمرے میں اندر جا کر کہنے لگے۔

تسی تے مینوں مصیبت پا دتی اے۔

مجید نظامی نے کہا

میں میں تہانوں مصیبت توں کڈن دی کوشش کیتی اے۔

تو کہنے لگے

میری بیوی بھی یہی کہتی ہے کہ تم ایکسٹینشن نہ لو۔ انہوں نے پشاور میں مکان تعمیر کروانا بھی شروع کر دیا ہے۔

جس پر مجید نظامی نے کہا۔

آپ کی بیوی آپ سے زیادہ سیانی ہیں میرا انہیں سلام کہیں......

بعد میں مجید نظامی جنرل کاکڑ کے ساتھ باہر آئے، کھانا کھایا اور ان سے کہا کہ جس طرح آج کل نیلم ویلی پر بھارت بمباری اور گولہ باری کر رہی ہے اس کے باعث سڑک بند ہے۔ لہٰذا وہ سڑک کھولنے کے لئے کوئی سکواڈ دیا جائے کیونکہ یہ سڑک بند ہو جانے کے باعث کشمیری مہاجرین کے لئے مجید نظامی کی طرف سے ہونے والا ریلیف کا کام رکا ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایکشن لیا اور سڑک کھلوائی اور اسی روز ہیلی کاپٹر سے مظفر آباد اور وہاں سے نیلم وادی گئے اور پورا دن گزار کر آئے۔

مجید نظامی کہتے ہیں جہاں تک جنرل جہانگیر کرامت کا تعلق ہے، وہ ایک شریف آدمی تھا، شکل صورت سے بھی سویلین لگتے ہیں۔ جب انہوں نے نیشنل سیکورٹی کونسل کا نظریہ دیا تو مجید نظامی اس دن راولپنڈی میں تھے اور محمود علی صاحب کی تقریب میں شریک تھے۔ انہوں نے نیشنل سیکورٹی کونسل کی مخالفت کی اور کہا اس طرح کی نیشنل سیکورٹی کونسل کسی جگہ نہیں ہے حتیٰ کہ بھارت میں بھی نہیں جسے ہم جمہوری ملک کہتے ہیں۔ وہاں بھی کیبنٹ کی ڈیفنس کمیٹی ہے۔ جو یہاں بھی

موجود ہے۔لہٰذا ڈیفنس کمیٹی سے ہی یہ کام لینا چاہئے۔ چنانچہ نواز شریف نے بھی اس کی مخالفت کی۔لیکن اس کے بعد جنرل جہانگیر کرامت جب نواز شریف سے ملے تو کہا ''میرا کوئی خاص مقصد نہیں تھا میں نے تو لیکچر دیا تھا ملٹری کالج لاہور میں......وہ کسی طرح اخبارات میں چھپ گیا۔ اس وقت جہانگیر کرامت کی مدت ملازمت تھوڑی رہ گئی تھی۔ پھر بھی انہوں نے نواز شریف سے کہا:

اگر آپ کو یہ چیز اچھی نہیں لگی تو میں استعفیٰ دے دیتا ہوں۔

مجید نظامی نظامی کہتے ہیں میاں نواز شریف صاحب نے ذرا Grace نہ دکھائی اور کہا: آپ استعفیٰ دے دیں۔

مجید نظامی کہتے ہیں اگر وہ وضعداری سے کام لیتے تو یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ کوئی بات نہیں آپ آئندہ محتاط رہیں اور اس بحث میں نہ پڑیں اور اس طرح جنرل جہانگیر کرامت کو اپنی ٹرم پوری کرنے دیتے مگر جب انہوں نے استعفیٰ مانگا تو ان کے چلے جانے کے بعد فون بھی کروایا کہ آپ کا استعفیٰ نہیں پہنچا۔

مجید نظامی کہتے ہیں کہ جہانگیر کرامت بے ضرر قسم کے چیف تھے جس طرح موقع ملنے کے باوجود جنرل اسلم بیگ کو ٹیک اوور کرنے کی جرات نہ ہوئی اسی طرح اشتعال کے باوجود جنرل جہانگیر کرامت نے کوئی قدم اٹھانے سے گریز کیا۔لیکن جنرل آصف نواز کو فارغ کرنے میں کامیاب ہونے کے بعد نواز شریف شیر ہو گئے تھے۔ مجید نظامی کہتے ہیں جہاں تک جنرل پرویز مشرف صاحب کے آرمی چیف بنائے جانے کا سوال ہے تو یہ نواز شریف کا اپنا فیصلہ تھا۔ حالانکہ پہلے میاں صاحبان کے امیدوار علی قلی خان تھے مگر ان کے بارے میں کسی نے میاں صاحبان کو غلط باتیں بتائیں کہ وہ گوہر ایوب کا بہنوئی ہے یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا جس کے بعد انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ گویا اس حوالے سے وہ کانوں کے بھی کچے تھے جو بات سنی اس پر اعتبار کر لیا، تصدیق کرنے کی کوشش نہ کی۔اس کھیل میں چودھری نثار کا بھی کچھ رول تھا جن کے بڑے بھائی

جنرل افتخار کا کچھ تبدیلی سے کھڑاک ہوا تھا۔

پھر میاں صاحبان نے جسٹس سجاد علی شاہ کے ساتھ چپقلش کا آغاز بھی کرلیا۔ ایک بار مجید نظامی بذریعہ طیارہ اسلام آباد سے لاہور آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ والی نشست پر ایک صاحب بیٹھے تھے جبکہ درمیان کی سیٹ خالی تھی۔ مجید نظامی سجاد صاحب کو نہیں پہچانتے تھے۔ سجاد صاحب نے خود تعارف کرایا

میں جسٹس سجاد علی شاہ ہوں۔

تو مجید نظامی نے کہا

بڑی خوشی ہوئی، میں معذرت چاہتا ہوں میں واقعی شکل سے آپ کو نہیں پہچانتا اور پوچھا آپ لاہور جا رہے ہیں تو ملاقات ہونی چاہئے۔

انہوں نے کہا

آج تو بڑا مصروف ہوں گا، واپس آنا ہے لیکن بعد میں انشاءاللہ ملاقات ہوگی۔

اس طرح ان کی اور مجید نظامی کی ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ پھر میاں نواز شریف جب سمری ٹرائل کورٹ کو لا رہے تھے تو سجاد علی شاہ ''حمید نظامی ڈے'' کی صدارت کے لئے لاہور آئے تھے۔ اس موقع پر میاں نواز شریف نے مجید نظامی سے کہا:

شاہ صاحب کو سمری ٹرائل کورٹ کے معاملے پر کچھ تحفظات ہیں تو آپ ہماری ملاقات کروادیں۔ تاکہ اختلاف رفع ہو جائے۔ چنانچہ مجید نظامی نے جسٹس سجاد سے بات کی وہ مان گئے اور اپنے ساتھ پنجاب کے چیف جسٹس اعجاز نثار کو لے آئے۔ وہ جمعہ کا دن تھا، اتفاق سے نماز جمعہ سے پہلے ہی آپس میں سمجھوتہ ہو گیا۔ جسٹس سجاد نے واضح طور پر نواز شریف سے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ کو Speedy trial چاہئے آپ Speedy Courts نہ بنائیں۔ میں ہائی کورٹ کے لیول پر بنچ بنا دوں گا اور انہیں پابند کریں گے کہ وہ پندرہ دن میں فیصلہ دیں اگر کسی نے اپیل کرنی ہوئی حکومت نے یا ملزم نے تو وہ اپیل سپریم کورٹ میں جائے گی وہاں مقررہ مدت

میں فیصلہ کی بھی گارنٹی دوں گا۔ چنانچہ سبھی بڑے خوش ہوئے سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ بڑی خوشی سے رخصت ہوئے۔ میاں صاحب بڑے مطمئن تھے۔ مگر رات کو میاں صاحب کا مجید نظامی کو فون آ گیا کہنے لگے:

جو فیصلہ ہوا تھا وہ تو ''کسی'' نے ویٹو کر دیا۔

مجید نظامی سمجھ گئے کہ کس نے ویٹو کیا لہٰذا کہنے لگے

آپ اس طرح کریں کہ یا تو ابھی سجاد صاحب کے پاس چلے جائیں یا صبح ناشتے پر اپنے ہاں بلا لیں یا انہیں کہیں کہ میں صبح آپ کے ساتھ ناشتہ کروں گا۔

نواز شریف نے ایسا کرنے کی بجائے ایسے لوگوں کو شاہ صاحب کے پاس بھیج دیا جنہوں نے معاملہ خراب کر دیا۔ مجید نظامی کہتے ہیں ویسے بھی یہ بات دونوں فریقین کے مابین رہتی تو معاملہ سلجھ جاتا۔ پھر جج صاحب نے جج مانگنے پر بھی تھوڑی سی برہمی کا اظہار کیا۔ اس پر مجید نظامی، غوث علی شاہ کے ہمراہ نواز شریف سے بات کر کے شاہ صاحب کو ملے۔ تو شاہ صاحب نے کہا

مجھے جج دے دیں تو میرا ان کا یہ راؤنڈ ختم ہو جائے گا۔

میاں صاحب کو مجید نظامی نے راضی کر لیا چنانچہ ٹی وی پر تقریر کے دوران انہوں نے جج دینے کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس وقت تک جسٹس سجاد علی صاحب اور صدر فاروق لغاری کی بھی آپس میں کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ جس وقت نواز شریف تقریر کر رہے تھے مجید نظامی جسٹس سجاد کے ساتھ کھانے کی میز پر ان کی یہ تقریر سن رہے تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے کہا

آپ نواز شریف کا شکریہ ادا کریں اور جس طرح ہم نے انہیں کہا تھا کہ آپ ساتھ ناشتہ کریں آپ سے بھی یہی درخواست ہے کہ آپ انہیں دعوت دیں۔

اتنے میں لاہور کی دو ''ہستیاں'' آ گئیں وہ فاروق لغاری کو مل کر آئی تھیں اور واپس لاہور جا رہی تھیں۔ شاہ صاحب نے ان میں سے ایک سے کچھ دیر گفتگو کی...... کیا گفتگو کی مجید

نظامی اس بات سے بے خبر تھے لیکن شاہ صاحب نے نواز شریف کا شکریہ ادا کرنے کے حوالے سے مجید نظامی کے مشورے کے جواب میں کہا کہ

Its too early کہ میں شکریہ ادا کروں۔

اس طرح اختلافات بڑھتے گئے۔ پھر سپریم کورٹ میں ہلہ گلہ اور حملہ ہوا۔ نواز شریف عدالت میں پیش ہو گئے مجید نظامی کہتے ہیں یہ ایک تسلسل تھا جو حالات کو خراب کرتا گیا لیکن ان کے خیال میں حالات کو درست رکھنا یا قابو رکھنا کوئی اتنا مشکل نہ تھا جتنا بنا دیا گیا۔ اب وہ جدہ میں بیٹھے ہیں۔

مجید نظامی نے جنرل پرویز مشرف سے پوچھا

یہ کیسے جدہ گئے؟

تو پرویز مشرف کہنے لگے

آپ کو تو اچھی طرح پتہ ہے سعودی عرب ہمیں تیل دے رہا تھا انہوں نے خواہش ظاہر کی، بات چیت ہوئی پھر انہوں نے جہاز بھیجا، لے گئے

تو مجید نظامی نے کہا

اب جنگ شروع ہے یا بغیر اعلانیہ اندرخانہ جنگ ہو رہی ہے۔ آپ شاید دوگنا تیل استعمال رہے ہیں۔ تیل تو یہ نواز شریف کے زمانے میں بھی آتا تھا اور اسی طرح آتا تھا۔ اب اگر وہ کہیں گے ہم کو آپ دوگنا تیل کر دیتے ہیں اور آپ کے مہمان واپس کر رہے ہیں۔ تو آپ وہ مہمان قبول کر لیں گے؟ تو وہ ہنسنے لگے۔

مجید نظامی اب بھی یہی بات کہتے ہیں کہ یہ اپنی ''بیٹی'' کی بات مان لیں ...... کیونکہ ملک اس وقت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف پاگل کروسیڈی بش ہے جو سنگل ورلڈ ''سپر پاور'' ہے امریکہ اور امریکن صدر کو یہ قوت اور طاقت ہم نے ہی مہیا کی ہے کیونکہ روس کو ٹکڑے کر کے سیکنڈ ''ورلڈ سپر پاور'' کو ختم کر دیا گیا اور اب امریکہ کا ٹارگٹ اسلام اور اسلامی مما لک ہیں یا چین ہے لیکن پہلا ہدف اسلام اور اسلامی مما لک ہی ہیں اس نے عراق اور افغانستان پر قبضہ کیا۔

اب امریکہ نے بھارت کو اپنا ''سٹریٹیجک الائی'' بنالیا ہے۔ظاہر ہے اصل ہدف پاکستان ہے فی الحال چین نہیں ہے۔

بھارت نہرو کے زمانے میں چین کے بالمقابل آ کر دیکھ چکا ہے کہ اس کی کچھ حیثیت نہیں تھی اور اب تک تو چین کئی گنا طاقتور بن چکا ہے، لیکن بھارت ہر لحاظ سے پاکستان پر ''دباؤ'' بڑھا رہا ہے۔ان دنوں ہی اس نے مزید ساٹھ ستر ہزار فوج کشمیر لانے کی بات کی ہے حالانکہ ساڑھے سات لاکھ پہلے سے موجود ہے جبکہ صدر مشرف کا کہنا ہے کہ آیئے کشمیر میں ''ڈی ملٹرآئزیشن'' کریں۔جبکہ انڈیا ''فوج'' کے بل بوتے پر کشمیر پر قابض رہنا چاہتا ہے اور لانگ ٹرم پلاننگ میں پاکستان کو خدانخواستہ صومالیہ یا ایتھوپیا بنانے کی تیاری کر رہا ہے۔پانی کشمیر سے آتا ہے اور اس وقت لاہور میں تیس فٹ پانی زیر زمین ہو چکا ہے اگر آئندہ پانی اور کم ہوا تو فصل نہیں ہوگی اور گندم کافی نہیں ہوگی جبکہ پاکستان کی معیشت زرعی ہے۔تھوڑی بہت ایکسپورٹ ہوتی ہے تو دال روٹی بھی چلتی ہے لیکن اب ہم ''ان'' کے رحم وکرم پر ہوتے جارہے ہیں اور ''وہ'' لوگ جنگ پر آمادہ رہتے ہیں اگر وہ اب رکے ہوئے ہیں تو اس وجہ سے کہ پاکستان اٹیمک پاور بن چکا ہے وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ جو ترقی وہ کر چکے ہیں کہیں وہ ساری ترقی ''اٹیمک وار'' کی وجہ سے ختم نہ ہو جائے۔

مجید نظامی 71ء کی جنگ کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اس دور کے ائیر چیف نے چکلالہ میں بریفنگ دی تھی تو اس نے کہا تھا وہ ایک فائٹر بھیجیں گے تو ہم دس بھیجیں گے۔خواہ سارے ختم ہو جائیں لیکن ہم ان کا ''ٹرامبے'' اڑا دیں گے ان کا ''ٹرامبے'' ہمارے کہوٹہ کے جیسا ہے۔مجید نظامی کہتے ہیں جب بریفنگ ختم ہوئی تو میں نے علیحدگی میں کہا کہ ہمارے ساتھ تو ایسے جرنلسٹ بھی ہیں جو ''پروگریسو'' یا ''پرو بھارتی'' ہیں......ان میں کچھ تو کل ہی ''امن کانفرنس'' میں شرکت کے لئے مشرقی یورپ جارہے ہیں لیکن ائیر چیف کہنے لگے...... ہمارا مقصد بھی یہی تھا کہ یہ اطلاع ''لیک'' ہو جائے تا کہ انہیں پتہ چل جائے کہ ہم تیار ہیں۔

یہ وہ فوج تھی کہ جو اپنی سربلندی کا خود احساس کر کے قوم کی کامیابی کا سہرا سروں کی زینت بنانے کا اعلان کرنا جانتی تھی اور سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ ادا کر کے ملک کو مضبوط قلعہ بنانے کا وصف رکھتی تھی اور جس کے لئے وطن کے تمام لوگوں کے دلوں سے دعاؤں کے صحیفے اڑ کر فوجی جیالوں کی حفاظت کا حصار کھینچا کرتے تھے۔ لیکن اب صورتحال یہ ہے ہم ایکسٹینشن کی بھیک مانگتے رہتے ہیں۔

ایک اور واقعہ یاد کرتے ہوئے مجید نظامی بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں کہ جب جنگ کا خطرہ سروں پر منڈلا رہا تھا جنرل ضیاءالحق اچانک کرکٹ میچ دیکھنے انڈیا چلے گئے۔ مجید نظامی نے جنرل ضیاءالحق سے کہا۔

اگر میں راجیو گاندھی ہوتا تو آپ کو پکڑ کر ''پنجرے'' میں بند کر دیتا۔

ضیاءالحق نے جواب دیا

آپ فوجی نہیں ہیں اس لئے یہ بات کر رہے ہیں۔ دراصل میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا تاکہ میں انہیں بتا سکوں کہ ہم ڈرنے والی قوم نہیں ہیں۔ کہتے ہیں ضیاءالحق نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ جو ''گیدڑ سنگھی'' آپ کے پاس ہے ہمارے پاس بھی ہے۔

انیسواں باب

اپنے تیروں کو اپنے سینے میں پیوست کرنے والے...... مجید نظامی

مجید نظامی کہتے ہیں کہ ہماری زندگی حرکت کے ساتھ متحرک ہے۔ اس لئے ہمیں مایوسیوں کی پستی میں نہیں گرنا چاہئے لیکن دنیا کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہوئے نیند سے بیدار رہنا چاہئے، حقائق سے باخبر اور دستور و قانون سے روشناس رہنا چاہئے اور سوچنا چاہئے یہ کیا دستور ہے کہ کمزور اور ناتواں لوگوں پر حکمرانی کا خواب دیکھنے والا امریکہ پاکستان سے کہہ رہا ہے کہ جو کچھ کیا گیا ہے ''کافی'' نہیں ہے...... ظاہری عظمت اور بلند قامت کے لئے مشکلات و مصائب میں گھرے ہوئے اور کتنے انسانوں کو پامال ہونا پڑے گا اور کب تک ہوا کے تند جھونکے پانی کے بلبلے کی طرح ''انسان'' کو یوں مٹاتے رہیں گے کہ گویا وہ کبھی تھے ہی نہیں......اور دوسری طرف انڈیا سے یہ کہنا کہ دہشت گردی کے حوالے سے پاکستان وعدے کرے کہ ''جہاد'' بند کر

دے یہ جانے بغیر کہ گرفتار قفس ناتواں لوگ محکومی کی زنجیروں میں پابجولاں ہیں۔ مسموم فضاؤں میں سانس لینا ان کے لئے دشوار ہے...... ''آزادی'' کا حق مانگنے والے کے لئے اگر جہاد کا راستہ بند کر دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدانخواستہ ہم کشمیر پلیٹ میں رکھ کر پیش کر رہے ہیں لہٰذا موجودہ دور کی اس نازک صورتحال کا ادراک ضروری ہے۔ ہمیں خاموش آندھی سے واسطہ پڑا ہوا ہے جو ایک قوت بن کے خصوصاً مسلمانوں کی دنیا کو اجاڑنے پر تل گئی ہے اور شہر خموشاں کا ماحول پیدا کرنا چاہتی ہے۔

صورتحال کی اس سنگینی میں مجید نظامی کی ماہرانہ رائے یہ ہے کہ آج ہمارے ملک میں ''پارلیمانی'' نظام کے سوا کوئی اور نظام نہیں چل سکتا کیونکہ یہ ''قائد'' کا دیا ہوا نظام ہے۔ صدارتی نظام ''ون مین شو'' کی طرح کا ہوتا ہے۔ جبکہ ایک قوم کا تصور صرف پارلیمانی طرز حکومت کے قائم ہونے سے ہی ابھرتا ہے۔ جس میں صوبائی خودمختاری ہے اور اس میں کشمیریوں، بلوچیوں، پٹھانوں، سندھیوں اور پنجابیوں کا کلچر شامل ہے۔ بے شک ہماری ایک ''اسلامی ثقافت'' ہے مگر اس میں الگ الگ رنگوں کے کھلتے ہوئے پھولوں کی طرح ہمارے صوبوں کے رنگ بھی شامل ہیں جن کا پس منظر اسلامی ہے۔ لہٰذا آئین کے اندر رہ کر صوبوں کو خودمختاری بھی دینی چاہئے۔ صوبے دراصل صدارتی نظام کی وجہ سے مطمئن نہیں ہیں اور وجود کا ایک حصہ تکلیف میں ہو تو سارا بدن دکھن محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا پاکستان کا مستقبل پارلیمانی نظام کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہونے میں مضمر ہے۔

مجید نظامی کہتے ہیں کہ ہماری گرتی ہوئی حالت پر اس وقت رات کی تاریکی پر ٹھہرے چاند ستارے بھی تمسخر اڑا رہے ہوں گے...... لیکن اہل ہمت کے ارادوں میں آرزوؤں اور امیدوں کا سمندر ہلکورے لے رہا ہے کہ بے رنگ و کوتاہ اور بے کیف زندگی کی پر یاس نگاہوں میں ستارہ سحر چمک رہا ہے۔ شب یلدا کی تاریکی میں نور اترنے کو ہے اور سیاہ بادلوں کے پیچھے سے نیا دن طلوع ہونے کو ہے۔

مجید نظامی کا بھی دل مایوس نہیں ...... مگر تشنہ ہے کیونکہ ایک سہانا خواب قوس وقزح کی طرح دلفریب ہے...... مفقود از نظر ہے...... مگر مجید نظامی کے دل صد پارہ میں ایک عزم آہنی ہے جو قبولیت کے لئے دست دعا ہے کہ خدایا! ''اسلام، نظریہ پاکستان اور جمہوریت کو سلامت رکھنا۔

مجید نظامی کم گو اور مطمئن دکھائی دیتے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنے تیروں کو اپنے ہی سینے میں پیوست کرتے رہتے ہیں۔ مجید نظامی کا سینہ تین مرتبہ گھائل ہو چکا ہے۔ ان کے تین بائی پاس ہو چکے ہیں، انہیں پہلا ہارٹ اٹیک راولپنڈی میں ہوا تھا جہاں انہیں وائف کے بھانجے جنرل ڈار نے سی ایم ایچ میں داخل کرایا تھا۔ سی ایم ایچ میں علاج کے بعد مجید نظامی بہت جلد صحت یاب ہو گئے، لیکن کچھ عرصے کے بعد امریکہ کے شہر بوسٹن میں ان کا پہلا بائی پاس ہوا جہاں انہوں نے تین ہفتے قیام کیا اس سفر میں مجید نظامی عمرہ ادا کرنے کے بعد روانہ ہوئے۔

مجید نظامی کو دوسرا اٹیک اٹھارہ سال کے بعد لاہور میں ہوا۔ یہ نواز شریف کا زمانہ تھا۔ شہباز شریف مورل سپورٹ کے لئے مجید نظامی کے ساتھ لندن گئے۔ یہ بائی پاس کرام ویل ہاسپٹل لندن میں ہوا۔ تقریباً تین سال قبل مجید نظامی اپنے ڈاکٹر شہریار سے یونہی گپ شپ لگانے کے لئے گئے۔ ڈاکٹر شہریار کو سیاست کا ''ٹھرک'' ہے۔ ڈاکٹر صاحب نماز بھی باجماعت ادا کرتے ہیں۔ مجید نظامی نے ملاقات کے لئے پوچھا...... آپ فارغ ہیں...... تو ڈاکٹر شہریار نے کہا...... میں نماز پڑھ لوں سٹاف ممبر آپکی ای سی جی کرتا ہے۔

مجید نظامی ان کے کلینک میں نارمل انداز میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ان کی ای سی جی کی گئی۔ ڈاکٹر شہریار نے رپورٹ دیکھی تو کہا...... نظامی صاحب! ای سی جی دوبارہ ہوگی...... ای سی جی خود کی۔ مجید نظامی کے استفسار پر ڈاکٹر شہریار نے کہا...... وہ ای سی جی رپورٹ سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے مجید نظامی کو فوراً ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کرلیا اور ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لے گئے جو ان کے ذاتی کلینک کے بالمقابل نہر کے پل کے پاس جیل روڈ پر تھا۔ لیکن اگلے ہی دن ''ڈاکٹرز ہسپتال'' منتقل کر دیا گیا لہٰذا تیسری سرجری پاکستانی ڈاکٹرز نے ''ڈاکٹرز ہسپتال''

میں کی۔سرجن ہاشمی کی بیگم امریکن ہیں نائن الیون کے بعدان کی بیگم نے پاکستان رہنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے شوہر محترم کولیکر امریکہ روانہ ہوگئیں۔

مجید نظامی انتہائی مناسب خدوخال کے مالک ہیں ریگولر واک کرتے ہیں،ان تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود تین مرتبہ بائی پاس کے مرحلے سے گزر چکے ہیں۔کیوں؟ یہ ٹینشن جو وہ خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں لیکن مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔

حمید نظامی بھی چالیس پینتالیس کی عمر میں دل کے عارضے کے باعث رخصت ہوئے۔حمید نظامی ایوب خان کے مارشل لاء کی وجہ سے ٹینس رہتے تھے برادر بزرگ کی طرح تو نہیں جو تحریک پاکستان میں طلباء کے ہراول دستے کے لیڈر تھے اور قائداعظم سے اچھی طرح واقف اور اقبالؒ کی خدمت میں حاضری دینے والے لیکن مجید نظامی نے بھی بطور طالب علم اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں تحریک پاکستان میں عملی طور پر شرکت کر کے ملک کو بنانے میں حصہ لیا ہے۔پاکستان میں "Mysterious" سیاسی اموات کے باب سے لے کر 71ء کی جنگ میں ملک کے دولخت ہونے کے ساتھ ساتھ آج تک فرد اتخلیق کرنے کے خواب کی پامالی مجید نظامی کے خاموش لفظوں کے پیکر میں موجود رہتی ہے۔برسوں گزر گئے انہوں نے انتظار کیا کہ پاکستان کو قائداعظمؒ کے ارشادات کی روشنی میں پارلیمانی جمہوریت لیکن اسلامی فلاحی مملکت کا مثالی نمونہ بنایا جائے گا اور وہ پرسکون فضا میں سکون سے سانس لیں گے۔

مگر خواہش وتمنا کا یہ گلاب ہوا کے تیز جھونکے اڑائے اڑائے پھرتے رہے اور پتی پتی بکھرتی رہی۔مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ جس چاردیواری کی حفاظت کے لئے دکھ اور درد کے طویل دن گزارے اسے افسوس کے ساتھ چھوڑ دیتے۔لہٰذا وہ پتھروں میں برہنہ پا گھوم رہے ہیں مگر نوائے وقت ان کی قیادت میں موثر ترین اخبار اور ہتھیار بنتا چلا گیا، مجید نظامی اور نوائے وقت دنیا بھر کے اردو دان حلقے میں بھرپور اور مستند حوالہ بن چکے ہیں۔انگریزی دان طبقہ بھی ملک کے اندر اور باہر بھی جن میں ''فارن'' عناصر بھی شامل ہیں ان کی ذات سے واقف ہیں۔مجید نظامی کئی مرتبہ

اخبارات کی نمائندہ تنظیموں اے پی این ایس اور سی پی این ای کے صدر رہ چکے ہیں اس سے پہلے لندن کامن ویلتھ پریس یونین اور کامن ویلتھ پریس کارسپانڈنٹس ایسوسی ایشن کے رکن رہ چکے ہیں جن کے ماہانہ اجلاس میں وزیراعظم یا فارن منسٹر برطانیہ مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کرتے تھے۔ ایسے اجلاسوں میں وہ چرچل، میکملن، ولسن ایسے وزراءاعظم سے مل چکے ہیں۔ ملکہ الزبتھ کی سالانہ چائے پارٹیوں میں بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ کرسچاف برزنیف روسی ڈکٹیٹروں کی پیرس کی پریس کانفرنس ہُوٹ کر چکے ہیں۔ جنرل ڈی گال، صدر نکسن اور صدر کینیڈی وغیرہ سے مل چکے ہیں۔

مجید نظامی نے ''نوائے وقت'' کے اداریوں میں ہمیشہ عوام کے بنیادی انسانی حقوق اور جمہوری آزادی کے حق میں آواز بلند کی ہے۔ نوائے وقت آج بھی جرات اظہار کی اپنی پالیسی پر ثابت قدمی سے گامزن ہے۔ مسلم امہ کا مفاد بھی ہمیشہ مجید نظامی کے پیش نظر رہا، افغانیوں پر کوئی غم ٹوٹے یا بوسنیا، چیچنیا اور عراق و فلسطین کے مسلمانوں پر کوئی افتاد نازل ہو، بنگلہ دیش کے محصورین امداد کے طالب ہوں یا کشمیریوں کو مدد کی ضرورت ہو یا زلزلہ زدگان مشکل وقت کا شکار ہوں مجید نظامی ہر آڑے وقت میں اپنے قارئین اور مسلمان بھائیوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کے لئے بوسنیا کی سفیر مقیم پاکستان کے ذریعے بھی خطیر رقم کا فنڈ بھجوایا گیا، جہاد کشمیر فنڈ، محصورین بنگلہ دیش فنڈ اور متاثرین زلزلہ زدگان فنڈ کا مسلسل اجرا جاری رکھا ہوا ہے۔

قائداعظمؒ نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کشمیر کے بغیر ادھورا ہے تکمیل پاکستان کے لئے کشمیر کا حصول ناگزیر ہے، اقوام متحدہ کی قراردادوں میں کشمیریوں کے حق خودارادیت کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا کشمیر ریلیف فنڈ کے ذریعے کشمیری مہاجرین کی مالی امداد کی جاتی ہے، ان کی بچیوں کی شادی کے لئے فنڈز مہیا کئے جاتے ہیں۔ ''سرٹیفائیڈ مجاہد کشمیر'' مجید نظامی کی وابستگی کشمیر اور اہل کشمیر کے لئے غیر متزلزل ہے۔ مجید

نظامی کی قومی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان انہیں سب سے بڑا سول اعزاز ''نشان امتیاز'' پیش کر چکی ہے اس سے پہلے ''ستارۂ پاکستان'' اور ''ستارۂ امتیاز'' بھی انہیں مل چکا ہے۔ ہیومن رائٹس سوسائٹی آف پاکستان نے نہایت فخر کے ساتھ مجید نظامی کو ''انسانی حقوق'' کا ایوارڈ پیش کیا جو 9 جنوری 2005ء کو لاہور میں ایک باوقار تقریب میں مجید نظامی نے وصول کیا۔

اپنی ذات میں ایک مکمل ''ادارے'' کا وصف رکھنے والے کم گو مجید نظامی اپنی نجی زندگی میں مہربان اور خوش اطوار شخصیت ہیں۔ دنیا کے تفکرات اور روزمرہ کی ہنگامہ آرائیوں سے دور کوئی مقام ایسا ہوتا ہے کہ جہاں کچھ دیر کے لئے خوابیدہ روح جاگ اٹھتی ہے اور انسان خود کو ہر قسم کی پریشانیوں سے آزاد محسوس کرنے لگتا ہے۔ مجید نظامی کا پسندیدہ شہر ''لاہور'' کے علاوہ لندن میں سات آٹھ سال رہنے کے باوجود استنبول، پیرس اور میونخ ہیں......قونیہ ترکی میں اقبالؒ کے پیر رومی کے مزار پر فاتحہ خوانی کر چکے ہیں۔ ان کی تصویر اپنے دفتر اور گھر میں اقبالؒ کے ساتھ رکھی ہوئی ہے۔ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ انہیں مشرقی موسیقی پسند ہے، سہگل کے علاوہ اقبال بانو کی گائی ہوئی غزل ''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'' شوق سے سنتے ہیں۔ ہر قسم کے لوگوں کو برداشت کر لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ اخبار نویس کا دفتر تو ''طوائف کا کوٹھا'' ہوتا ہے۔ ادب سے خاصی دلچسپی ہے شاعری اور افسانے پڑھنے سے لگاؤ ہے، ایام جوانی میں سعادت حسن منٹو کو شوق سے پڑھتے تھے،

فیض کے مداح ہیں ''شاعر'' فیض کے، ''ایڈیٹر'' فیض کے، لیکن ''سیاسی'' فیض کے نہیں۔ نئی نسل سے زیادہ تضاد محسوس نہیں کرتے کیونکہ سمجھتے ہیں کہ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ کافی حد تک مذہبی شخصیت ہیں بچپن میں بھی مزاروں پر میلہ دیکھنے جایا کرتے تھے، ابھی کچھ دن پہلے خیابان چوراشریف میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دنیا اور آخرت میں نجات کا ذریعہ ہے۔ خدا ہم سب کو اسی راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ چورہ شریف کے سجادہ نشین پیر کبیر علی شاہ کو معلوم نہیں مجید نظامی کی کیا ادا بھا گئی ہے کہ ان کے اعزاز میں پیران عظام کا ایک اجتماع کر چکے ہیں حالانکہ مجید نظامی کا کہنا ہے کہ بندہ عاجز اس اعزاز کا مستحق نہیں لیکن پیر صاحب محترم بہتر جانتے ہیں۔

بیسواں باب

مجید نظامی نظریاتی سرحدوں کے ''کمانڈر انچیف'' ہیں

میاں آفتاب فرخ

روحانی دوا کے طور پر بھی کوئی دوست ہی ہو سکتا ہے جو شکستہ ہونے سے بچا سکے، بہت ساری باتیں ہوتی ہیں جو صرف دوست سے زیر بحث لائی جا سکتی ہیں اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہم آہنگی میں کوئی ایسا مقام آ جائے کہ دونوں ایک وقت میں ایک ہی بات سوچ رہے ہوں، ایک ہی تیر سے گھائل ہو رہے ہوں اور ایک ہی منظر کی دلکشی سے مہمیز ہو رہے ہوں اور وہ لفظ جنہیں گویائی کی خلعت نہ پہنائی گئی ہو...... سینے میں بند ہو کر بھی سنائی دے رہے ہوں۔ میاں آفتاب فرخ اور مجید نظامی کا تعلق بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ آفتاب فرخ مجید نظامی کو اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ تحریک پاکستان کی سربلندی کے لئے کوشاں تھے۔ جس وقت ہندوؤں نے

سنگ باری کر کے عبدالمالک کو شہید کیا تو اس وقت مجید نظامی عبدالمالک کے برابر کھڑے تھے۔ لیکن آفتاب فرخ باہر میدان میں تھے۔ انہیں تصویریں بنانے کا شوق تھا، لہٰذا ان کی عقاب جیسی آنکھوں میں وہ لمحہ بے معنی آواز کی طرح گم نہیں ہونے دیا بلکہ کیمرے کی وساطت سے آنکھوں کی پتلیوں میں محفوظ کر لیا۔ نظریہ پاکستان ٹرسٹ میں عبدالمالک شہید کی وہی تصویر آج بھی آویزاں ہے۔

زمانہ طالب علمی کے بعد زندگی کے اسرار و رموز میں سرگرداں مجید نظامی اور آفتاب فرخ اپنے اپنے راستوں پر گامزن ہو گئے...... مجید نظامی لندن چلے گئے تو آفتاب فرخ ان کا لکھا ہوا مکتوب لندن شوق سے پڑھا کرتے تھے...... آفتاب فرخ کی ان دنوں مجید نظامی کے چھوٹے بھائی خلیل نظامی سے خاصی دوستی تھی۔ حمید نظامی سے بھی والد کے ہم عصر لیگ موومنٹ کے حوالے سے سلام دعا تھی۔ حمید نظامی کے ساتھ ''گارڈینیا'' کی محفلوں میں بھی شریک ہوا کرتے۔ آفتاب فرخ اور مقبول باٹا ان لوگوں میں جونیئر ترین تھے۔

آفتاب فرخ مجید نظامی کا نہ صرف ''مکتوب لندن' بڑے اشتیاق سے پڑھتے تھے بلکہ مجید نظامی کی لندن کی رہائش کا ایڈریس بھی زبانی یاد تھا لہٰذا خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ جب حمید نظامی بار الم اور افسردگی کے بوجھ سے ناتواں روح کے ہاتھوں مضطرب ہوئے تو آغا شورش کاشمیری نے مجید نظامی کو لندن سے بلا لیا۔ حمید نظامی کے گزر جانے کے بعد ٹیمپل روڈ کی رہائش گاہ پر آفتاب فرخ اور مجید نظامی کا شب و روز کا ساتھ رہا جس کی وجہ سے وہ تعلق پیدا ہو گیا جس کے حلقہ دام سے دونوں نکل نہیں سکے۔ حمید نظامی کی وفات کے بعد اخبار کی حالت مخدوش تھی جبکہ آفتاب فرخ کے کیریئر کی بھی شروعات تھیں۔ آفتاب فرخ کہتے ہیں اچھی بات یہ تھی کہ مجید نظامی کی ضرورت حمید نظامی نے خود تحریری اور قانونی طور پر محسوس کی تھی۔ حمید نظامی موت کی چادر میں چھپ کر بھی اپنے بھائی کو کچھ باتیں سمجھا گئے ورنہ معموں کا حل کرنا شاید مجید نظامی کے لئے دشوار ہو جاتا۔

آفتاب فرخ نے بتایا کہ حمید نظامی کی وفات کے وقت مجید نظامی نے بھابھی محترمہ یعنی مسز حمید نظامی کو پیغام دیا ہوا تھا کہ آپ کو آپ کے تمام حقوق ملتے رہیں گے مگر اخبار میں عملی طور پر عمل دخل نہیں ہوگا لیکن ایک دن جب بھابھی صاحبہ ڈاکٹر مبشر حسن ''فیملی فرینڈ'' کے بہکاوے میں آکر دفتر تشریف لے آئیں تو مجید نظامی کوئی بات کیے بغیر خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے اور کوئی تکرار یا جھگڑا نہیں کیا۔ آفتاب فرخ کہتے ہیں اس دن کے بعد مجید نظامی سے تعلق کی جو شمعیں روشن تھیں ان کی لو کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ اس وقت ذاتی دوستوں میں آفتاب فرخ اکیلے ہی مجید نظامی کے ساتھ نہیں تھے بلکہ حمید نظامی مرحوم کے دوست بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ندائے ملت کا اجراء کرنے کے لئے پرانی انارکلی میں ایک بڑی بلڈنگ کا گراؤنڈ فلور کرائے پر لیا۔ فرش پر قرآن خوانی سے نئے اخبار ندائے ملت کے دفتر اور پریس کا آغاز کیا گیا۔ نوائے وقت کا کچھ عملہ ساتھ تھا۔ مجید نظامی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جو میرے ساتھ آنا چاہے آ سکتا ہے اور جو ان کے ساتھ رہنا چاہے رہ سکتا ہے یوں ''رسم حسینؓ'' کی کہانی دہرائی گئی تھوڑی دیر کے لئے چراغ گل کر دیا گیا۔ روشنی ہوئی تو بہت سارے لوگ قافلہ بننے کے لئے مجید نظامی کے ساتھ موجود تھے۔ البتہ مجید نظامی نے ساتھ آنے والوں سے اتنی درخواست کی کہ شروع میں جس کی جتنی ضرورت ہو اتنے پیسے لیں اور یک دم تنخواہ کا مطالبہ نہ کریں۔ تنخواہ اتنی ہی رہے گی جتنی ملتی تھی مگر باقی تنخواہ اکاؤنٹ میں کریڈٹ کے طور پر جمع ہوتی رہے گی لہٰذا سب کو جیب خرچ ملتا رہا۔ مجید نظامی کا ساتھ دینے والے لوگ مخلص تھے اور مجید نظامی کی کریڈیبلٹی کا یہ عالم تھا کہ کاغذ والا بھی ضرورت کے مطابق کاغذ دے دیا کرتا تھا۔ کاروباری لوگوں میں ''ساکھ'' اچھی ہونے کے باعث کچھ ہی دنوں میں عملے کی تنخواہیں بھی وقت پر ملنا شروع ہو گئیں چونکہ پریس اپنا تھا لہٰذا اخبار بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

مشکل دنوں کو یاد کرتے ہوئے آفتاب فرخ کہتے ہیں ایک مرتبہ گارڈینیا میں ''ندائے ملت'' کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ ان دنوں finance کا مسئلہ تھا۔ ایک بہت بڑے

نامور وکیل سے کراچی ٹیلی فون پر بات ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگے پانچ دس ہزار کے شیئرز میں لے لیتا ہوں۔ ٹیلی فون بند ہونے پر آفتاب فرخ نے کہا کہ پانچ دس ہزار کے شیئرز تو میں بھی لے سکتا ہوں کیونکہ اس وقت حیثیت ہی یہی تھی لیکن مجید نظامی نے کہا میں غریب دوست مار نہیں ہوں۔ انہوں نے نہ کراچی کے دوست کی پیشکش قبول کی نہ آفتاب فرخ کی، بہر حال ندائے ملت کا زمانہ حیات ایک سال سے زیادہ کا نہیں تھا۔ ان سے پھر آ ملنے کے لئے ''رابطہ'' کیا گیا نوائے وقت تو نوائے وقت ہی رہا لیکن ندائے ملت لمیٹڈ کی پرسکون آغوش میں پناہ گزین ہو گیا اور مسائل کے باوجود خوب ترقی کی۔ ملتان، کراچی، اور پنڈی کے علاوہ اسلام آباد کا ایڈیشن نکالا گیا۔ ''دی نیشن'' بھی منصۂ شہود پر آیا اب لاہور کے علاوہ کراچی اور اسلام آباد سے بھی نکل رہا ہے۔ خواتین خانہ کے لئے ہفت روزہ ''فیملی'' بچوں کے لئے ماہنامہ ''پھول'' اور انٹرنیشنل اردو میگزین ہفتہ وار ''ندائے ملت'' بھی نکل رہا ہے۔

آفتاب فرخ بتا رہے تھے کہ مجید نظامی عادات میں ریگولر ہیں، خوش شکل خوش پوشاک مگر سادہ مزاج ہیں، مذہبی شخصیت ہیں، حج اور عمرے ادا کرتے رہتے ہیں، کم گو ہیں لہٰذا دوسروں کی زیادہ سنتے ہیں، کشمیر کاز پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے اور اپنی مکمل حفاظت کے لئے جنگ کے حامی ہیں۔ مجید نظامی عمر بھر انڈیا نہیں گئے اور آفتاب فرخ بھی کبھی انڈیا نہیں گئے ...... لہٰذا مجید نظامی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ''مجید نظامی سرحدوں کے کمانڈر انچیف ہیں''۔

میاں آفتاب فرخ دوستی اور ہم آہنگی کے عہد ناموں کی توثیق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجید نظامی ''دوربین'' نظر رکھتے ہیں کسی ایکشن کا پاکستان کے مفاد یا نظریہ پر کیا اثر پڑے گا ...... مجید نظامی اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیتے ہیں اور پھر اپنی رائے صادر فرماتے ہیں اور پھر بھرپور جرأت کے ساتھ بھرپور اظہار خیال کرتے ہیں اور کسی عہدے یا شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ذہانت، اعتماد اور جرأت کے ساتھ ساتھ مجید نظامی کی حس مزاح بھی تیز ہے۔

آفتاب فرخ نے بتایا کہ ان کا ایک بیٹا انگلستان میں چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہے لہٰذا وہ

لندن جاتے رہتے ہیں۔ مجید نظامی جب لندن جاتے تھے تو ان کی ایک بزرگ عزیزہ انہیں زبردستی میزبانی کا شرف بخشتی تھیں، سامان بھی ہوٹل سے اٹھا لاتی تھیں، مرحومہ ہو چکی ہیں۔ خدا غریق رحمت کرے۔ حالانکہ ذاتی طور پر مجید نظامی کسی کو بھی تکلیف دینا نہیں چاہتے۔ جن دنوں مجید نظامی ان کے گھر لندن میں تھے آفتاب فرخ نے ان سے ملنے کا پروگرام بنایا تو دونوں قریبی ''لنڈیز'' کافی شاپ میں چلے گئے۔ لنڈیز میں کافی شاپ میں کام کرنے والی خواتین تقریباً ساٹھ ستر برس کی ہوا کرتی تھیں۔ یہ پانچ چھ برس پہلے کا واقعہ ہے کہ جب آفتاب فرخ اور مجید نظامی بھی ساٹھ سے کم کے نہیں تھے۔ جب خاتون ویٹریس آرڈر لینے کے لئے آئی تو مجید نظامی کی حس مزاح پھڑکی، کہنے لگے۔

اے کڑی کی کہندی ہووے گی؟ اے بچے کتھے آ گئے نیں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ آفتاب فرخ کو یاد آیا کہ جن دنوں وہ مجید نظامی کے ساتھ گارڈینیا میں بیٹھا کرتے تھے ان دنوں ایک اور صاحب بھی جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنی حکومت کے ساتھ ساتھ امریکہ کی بھی رپورٹنگ کرتے ہیں وہ بھی آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ایک دن آفتاب فرخ نے مجید نظامی سے کہا۔

اے وچ آ جاندا اے تے خاموشی کرنی پیندی اے۔

تو مجید نظامی نے فوراً جواب دیا

ساڈے طفیل اودی دال روٹی چلدی اے سانوں کی۔

آفتاب فرخ کہتے ہیں مجید نظامی کا ''معافی'' کا خانہ بھی مجھ سے زیادہ وسیع ہے اور یہ خوبی میرے کردار سے مختلف ہے۔ ایک تقریب ''اقبالؒ ڈے'' کے حوالے سے تھی۔ اقبالؒ کے حوالے سے بات ہوا کثر تقریریں حکومتی حوالے سے خوش کن نہیں ہوتیں ......اس جلسے میں ایک صاحب جو مجید نظامی سے نیاز مندی رکھتے تھے وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جلسے کے بعد حکمرانوں کو خط لکھا کہ اقبالؒ ڈے کا بہانہ تھا دراصل یہ سارا حکومت کے خلاف تھا۔ وہ خط نظامی

صاحب کے تعلقات کی وجہ سے ان کے پاس پہنچ گیا۔آفتاب فرخ کہتے ہیں میں ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ مجید نظامی نے بات کیے بغیر وہ خط میرے سامنے کر دیا۔ مجید نظامی عموماً ان ڈائریکٹ بات کرتے ہیں تا کہ سیکنڈ "opinon" بھی حاصل کر سکیں۔ اس واقعہ کے بعد آج آفتاب فرخ اس شخص کے ساتھ رسمی سلام دعا سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن وہ مجید نظامی سے ملتا رہا بلکہ اس نے سفارش کروا کر عہدہ بھی حاصل کیا جس پر وہ آج تک فائز ہے۔

آفتاب فرخ کہتے ہیں کہ بعض اوقات مجید نظامی کوئی تحریر میرے سامنے کر دیتے ہیں تا کہ میں رائے دوں بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود بھی اسی بات پر اٹکے ہوئے تھے لہٰذا ''کنفرم'' کر لیتے ہیں کہ یقیناً یہی بات درست نہیں ہوگی اور پھر کہتے ہیں اس کو کاٹ دیتے ہیں۔ بطور ایڈیٹر ان کا کمال یہ ہے کہ زیر زبر پیش کے ساتھ مفہوم بلند و پست کر سکتے ہیں جیسے ایک نقطہ ''محرم'' سے ''مجرم'' بنا دیتا ہے۔ یہ وصف بہت کم ایڈیٹرز کو جاتا ہے کہ معمولی تبدیلی کے ساتھ کوئی بڑی تبدیلی لے آئیں۔ بطور ایڈیٹر کوئی حکمران ان کے ہوتے ہوئے news kill نہیں کروا سکتا۔ شنید ہے کہ کچھ اخبارات خبریں kill بھی کرتے ہیں مگر مجید نظامی کسی نہ کسی طرح نیوز قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔

پیشہ ورانہ تعلقات میں اپنے سے سینئرز صحافیوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ہر کالم پڑھتے ہیں۔ اخباری معاملے میں اگر رپورٹنگ کی خبر صحیح ہو یعنی جینوئن رپورٹنگ ہو تو خواہ حکمران اعلیٰ ناراض ہو جائیں مجید نظامی سامنا کرتے ہیں کوئی کارکن ساتھی پھنس جائے تو اس کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں خواہ وہ دور افتادہ مقام کا معمولی نامہ نگار ہی کیوں نہ ہو۔ آفتاب فرخ نے ان کے دو تین مقدمات کی پیروی کی ان میں ایسے پوائنٹس تھے کہ مدمقابل کو ڈٹ کر نیچے پھینکا جا سکتا تھا مگر مجید نظامی نے صورتحال کو "own" کیا۔ اسی طرح غلط رپورٹنگ کی صورت میں ٹھیک ٹھاک انکوائری کرتے ہیں اور پھر ایکشن، تنبیہہ یا جرمانہ کرتے ہیں۔

مجید نظامی دوستوں کے بارے میں کتنے مخلص ہیں اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے کیا

جاسکتا ہے کہ آفتاب فرخ اور مجید نظامی کے ایک مشترکہ دوست شیخ رضی الدین ہیں۔ شیخ صاحب خوش خوراک ہیں آفتاب فرخ کہتے ہیں ویسے خوش خوراک تو میں بھی ہوں پہلے ٹھیک ٹھاک کھایا کرتا تھا مگر پھر اوپن ہارٹ سرجری کے بعد کھانا کم کر دیا۔ ایک دن تینوں دوستوں کا ''آواری'' میں سوپ پینے کا پروگرام بنا۔ آفتاب فرخ نے صبح گیارہ بجے کے قریب مجید نظامی کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ انہیں ٹمپریچر ہے اور وہ گھر میں ہی موجود ہیں یہ ایک خلاف توقع واقعہ تھا۔ مجید نظامی نے کہا...... شیخ صاحب کو بھی میری ناسازی طبع کی خبر کر دیجئے گا۔ لہٰذا آفتاب فرخ نے شیخ صاحب کو فون پر نوٹ کروادیا کہ آج کا پروگرام کینسل ہے۔ شیخ صاحب کو شاید یہ غلط فہمی ہوگئی کہ پروگرام آفتاب فرخ نے کینسل کروادیا ہے۔ فون پر شیخ صاحب جلال میں آگئے۔ اس وقت آفتاب فرخ کے سامنے ان کے کلائنٹ بیٹھے ہوئے تھے لہٰذا وہ غصے کا جواب نہ دے سکے لیکن دل میں برا منایا اور آئندہ نہ ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن ایک دن مجید نظامی نے اپنے آفس میں دونوں کو پکڑ لیا اور اکٹھا کر کے چھوڑا اور کہا یہ ہماری لڑنے کی عمر نہیں ہے...... اس بات پر میاں آفتاب فرخ کو میں نے اپنا ایک شعر سنایا

دوستوں کی آپس میں دشمنی نہیں ہوتی
دوستوں کی آپس میں رنجشیں تو ہوتی ہیں

مجید نظامی دوستوں کی خبر رکھتے ہیں۔ آفتاب فرخ 2003ء میں ایک دن گالف کھیل رہے تھے، کچھ تکلیف محسوس کی تو ڈاکٹر کے پاس چلے گئے ڈاکٹر نے دس سے پانچ بجے تک انہیں چھٹی نہ دی ڈاکٹر نے بتایا کہ اس دوران مجید نظامی کے دس ٹیلی فون آچکے ہیں۔

مجید نظامی کی خودی اور خودداری کے معاملے میں کمپرومائز نہ کرنے کی عادت کا یہ عالم ہے کہ امریکن قونصلیٹ کا فون آیا

آپ کی ملاقات کا وقت مقرر ہے اتنے بجے آجائیے۔

مجید نظامی نے کہا

لیکن میں نے تو ملاقات کے لئے وقت نہیں مانگا تھا۔ مجھے ضرورت نہیں ہے ہاں اگر انہیں ضرورت ہے تو دفتر یا گھر تشریف لا سکتے ہیں۔

خدا مجید نظامی اور آفتاب فرخ کی بے غرض دوستی کو یونہی مہکائے رکھے لیکن دل چاہتا ہے کہ یہ بات کہوں ...... آؤ ان اشجار کے سائے میں بیٹھیں جن کے پھول سچائی کی خوشبو پھیلا رہے ہیں اور روزنوں سے روشنی راستہ دکھائی رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہمارے جسم کسی زنداں کی اونچی دیوار کا حصہ بن جائیں اور آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہ کر سکیں لہذا سوچنا ہو گا کہ ہمیں صبح کا ہم نشیں بننا ہے یا ظلمت زادوں میں شمار کرنا ہے ...... کیا شب کے خوف سے طیور پرواز کا فن چھوڑ دیں گے۔



سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

اکیسواں باب

مجید نظامی صاحب کی شخصیت کے بارے میں

سابق وزیراعظم جناب محمد نواز شریف کے خیالات

مجید نظامی کا نام آتے ہی نظریہ پاکستان اپنی پوری شان سے ذہن کے پردہ سیمیں پر جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔انہوں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا اور بتدریج پاکستان بنتے دیکھا۔پاکستان کیلئے جان و مال اور عزت و آبرو کی جو قربانیاں دی گئیں نظامی صاحب ان کے عینی شاہد ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی جو قدر و قیمت انکے ہاں ہے وہ بہت کم پاکستانیوں کے ہاں دیکھنے میں آئی ہے۔ برصغیر کی تقسیم کی اصل وجوہات اور پاکستان سے محبت و عشق کے جذبات نئی نسل تک منتقل کرنا انہوں نے اپنا مشن بنا رکھا ہے جس کی تکمیل کے لئے وہ نوائے وقت اور نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن ایسے اداروں کو نہایت عمدگی سے کام میں لا رہے ہیں۔اگر نظریہ پاکستان کا خدانخواستہ کوئی بھی حامی نہ رہے تو میرا ایمان ہے کہ مجید نظامی تن تنہا اس نظریے کی شمع روشن کیے رکھیں گے اور جلد ہی وہ مقام حاصل کر لیں گے کہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

بطور صحافی وہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اور حمید نظامی ایسی عظیم شخصیات کی قائم کردہ روایت کے امین ہوتے ہوئے ایک ماورائی شخصیت (Legend) بن چکے ہیں۔ آج کے دور میں صحافت کم وبیش صنعت کا درجہ اختیار کر چکی ہے لیکن نظامی صاحب اسے مشن سمجھ کر نظریے کو کسی بھی قیمت پر نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ موجودہ دور میں جابر ''سلطان'' کے سامنے کلمۂ حق کہنے میں کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔

آپ پاکستانی قومیت کے ساتھ ساتھ مسلم امہ کے تصور کے بھی موید و دمساز ہیں۔ اس میدان میں وہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کو اپنا امام سمجھتے اور اس بات کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

نظامی صاحب ''کتاب ہدیٰ'' کے سبق کے مطابق ہمیشہ انسانوں کے کام آنے کی عبادت کرنے میں بھی مشغول رہتے ہیں۔ ان کی باتیں سادہ، کھری، بامقصد اور دل آویز ہوتی ہیں، تاہم کبھی کبھی کارتریاقی کرنے والی تلخ نوائی سے بھی کام لیتے ہیں۔ آپ دوستوں کے دوست ہیں لیکن کردار اور نظریات کے حوالے سے حلقۂ احباب میں بھی تنقید کے حق سے کبھی دستبردار نہیں ہوتے۔

مجید نظامی کے پاس بیٹھ کر انسان کو محبت کی مٹھاس اور ٹھنڈک ملتی ہے۔ موجودہ معاشرے کی حدت اور حبس میں نظامی صاحب ایک شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ کے ساتھ عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لینے پر سیکرٹری جنرل آل انڈیا مسلم لیگ جناب لیاقت علی خان نے ''مجاہد پاکستان'' کا سرٹیفکیٹ اور ایک تلوار دینے کا اعزاز بخشا وہ سرٹیفکیٹ

آج بھی حمید نظامی ہال میں آویزاں ہے۔

لندن کے نامور مصنف ہربرٹ فیلڈمن نے اپنی کتاب ''فرام کرائسس ٹو کرائسس'' میں دورِ ایوبی میں پاکستان کی سیاسی اور صحافتی صورتحال پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ نوائے وقت اوراس کے ایڈیٹر مجید نظامی کو دلیرانہ کردار پر کھلے لفظوں میں اعتراف کیا۔

☆☆☆☆☆

بھارت کے سابق ہائی کمشنر پارتھا سارتھی نے مجید نظامی اوران کے اصولوں کو معنی خیز الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کرتے ہوئے ایک سوال ''کہ بھارت اور پاکستان کی دوستی کی راہ میں سب سے بڑا پتھر کون ہے؟'' کے جواب میں کہا:

In one word Nizami .... He is the only obstacle.

☆☆☆☆☆

مشہور بھارتی صحافی کلدیپ نیئر نے نیو دہلی امن کانفرنس میں کہا کہ جب سابق وزیراعظم نواز شریف سے ایٹمی دھماکہ کرنے کی بابت میں نے پوچھا تو وہ کہنے لگے

''اگر میں دھماکہ نہ کرتا تو مجید نظامی نے مجھے نہیں چھوڑنا تھا''

☆☆☆☆☆

امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں شائع ہونے والے موقر انگریز جریدے ''پاکستان لنک'' میں مواحد حسین سید نے ''صحافت کی اپنی قسم کی شخصیت'' کے عنوان سے مجید نظامی کے لئے جو مضمون لکھا اس میں کہا:

''پاکستان میں صحافت کی باعظمت اور باوقار شخصیت مجید نظامی نے حال ہی میں ''نوائے وقت گروپ آف پیپرز'' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی زندگی کے چالیس برس پورے کئے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایوان صدر میں عارضی قیام پذیر پاکستان کے صدور کے مقابلے میں ملک میں مجید نظامی کا

اثر ورسوخ زیادہ ہے۔ باخبر لوگ انہیں ''ڈان'' سے تشبیہ دیتے ہیں جو یورپی دریا ''ڈینیوب'' کا معروف نام ہے۔ پاکستان کے نظام سیاست اور نظریاتی جہت میں مجید نظامی بھی ڈان دریا کی طرح خاموشی اور گہرائی سے رواں دواں رہنے والے انسان ہیں۔

☆☆☆☆☆

بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصراللہ خان نے دورہ کراچی کے موقع پر مجید نظامی اور ''نوائے وقت'' کے جمہوری کردار کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا:

''اس ملک کی صحافت اور سیاست میں اسلام اور پاکستان کی جو بات ہوتی ہے اس میں مجید نظامی صاحب کا بنیادی کردار ہے۔ جمہوریت کی بات انہی کے دم قدم سے وہ نہ ہو تو ''زرد صحافت'' چھا جائے گی۔ میں صاف طور پر کہتا ہوں کہ کشمیر کو جو ترجیح حاصل ہے یہ مجید نظامی کی بدولت ہے۔

☆☆☆☆☆

پاکستان مسلم لیگ کے صدر چوہدری شجاعت حسین نے جناب مجید نظامی کی پچاس سالہ دینی، ملی، قومی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں مشائخ عظام کی جانب سے تقریب کے انعقاد کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا:

''مجید نظامی سچے اور پکے نظریاتی مسلم لیگی ہیں جن کے ساتھ عوام کا کاروباری نہیں بلکہ نظریاتی رشتہ ہے اور ہر سطح پر ان کا عقیدت واحترام اس لئے ہے کہ انہوں نے صحافت کو عبادت سمجھا ہے تجارت نہیں''۔

☆☆☆☆☆

وزیراعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی نے اپنے پیغام میں کہا:

"مجھے یہ جان کر دلی خوشی ہوئی ہے کہ جدوجہد آزادی کے ایک پر جوش اور متحرک کارکن اور نامور صحافی جناب مجید نظامی کی پچاس سالہ دینی، ملی، قومی اور صحافتی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اعتراف خدمت کیا جارہا ہے"۔

مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل مشاہد حسین سید نے کہا:

"مجھے فخر حاصل ہے کہ میرے والد کرنل (ر) امجد حسین حمید نظامی مرحوم کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور یہی نسبت ہمارے سارے خاندان کی مجید نظامی سے حاصل ہے۔ مجید نظامی نے ہمیشہ حکمرانوں کا مقابلہ قلندرانہ جرات کے ساتھ کیا۔ انہوں نے نہ صرف نوائے وقت کی پالیسی برقرار رکھی بلکہ اسے تجارتی اور کاروباری لحاظ سے بھی مستحکم کیا۔ 1998ء میں ایٹمی دھماکہ کرانے میں مجید نظامی کا کلیدی کردار ہے ان کی جرأت کے باعث اس وقت کی حکومت کو رہنمائی ملی۔ اگر ان کا مشورہ مان لیا جاتا تو شاید پاکستان جمہوریت کی پٹڑی سے نہ اترتا۔

☆☆☆☆☆

حریت کانفرنس کے رہنما سید علی شاہ گیلانی نے سری نگر سے براہ راست ٹیلی فونک خطاب میں نوائے وقت کے کردار کو سراہتے ہوئے بھرپور خراج تحسین پیش کیا اور ادارہ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر جناب مجید نظامی کا خصوصی شکریہ ادا کیا کیونکہ یہ واحد اخبار ہے جو مسئلہ کشمیر اور کشمیری عوام کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مجید نظامی بابائے صحافت ہیں معروف کشمیری مجاہد یاسین ملک نے مجید نظامی اور ادارہ نوائے وقت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا "میرے لئے یہ اعزاز کہ نوائے وقت کے دفتر آ

کر سامعین سے بات کر رہا ہوں۔'' اگر چہ نظامی صاحب ابھی ''بابا'' کہلانا پسند نہیں کرتے۔

☆☆☆☆☆☆

بنگلہ دیش میں محصور پاکستانیوں کی تنظیم نے ''پاکستان ہائی کمشن'' کی طرف سے بنگلہ دیشی' بہاری کہنے اور وزیراعظم شوکت عزیز کے وقت کی قلت کے باعث ملاقات نہ ہونے پر احتجاج کیا 25 ہزار محصورین کی واپسی کی کوششوں کے لئے مجید نظامی کی خدمت کو خراج تحسین پیش کیا۔ جنہوں نے محصورین پاکستان کے لئے نوائے وقت ریلیف فنڈ سے دس لاکھ کی آٹھویں قسط بھجوادی تھی۔ اور باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ دس لاکھ کی قسط بھجوا رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

نوائے وقت نے جب متاثرین کشمیر کے لئے ایک کروڑ کا ریلیف فنڈ قائم کیا تو تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ امداد قابل تحسین ہے۔

☆☆☆☆☆☆

آزاد کشمیر کے وزیراعظم سردار سکندر حیات نے نوائے وقت کی طرف سے سکولوں کی تعمیر کے لئے پچاس لاکھ روپے فنڈ مہیا کرنے کو قابل تقلید مثال قرار دیا۔ اتنی ہی رقم اس فنڈ سے بالاکوٹ کے سکول کے لئے مختص کی۔

☆☆☆☆☆

ولی خان مرحوم نے مجید نظامی اور روزنامہ نوائے وقت کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہوئے کہا تھا ''روزنامہ نوائے وقت اور اس کے ایڈیٹر انچیف صحافت کی اعلیٰ قدروں کی پاسداری کرتے ہیں اگر چہ اس اخبار کی پالیسی کے بعض نکات سے ہمیں اختلاف ہے لیکن اسکے باوجود اس کی خبروں اور رپورٹنگ پر ہمارا اعتماد ہے کیونکہ یہ اخبار کسی خبر کو موڑ توڑ کر پیش نہیں کرتا''۔ مجید نظامی نے ولی باغ جا کر مرحوم ولی خاں کی تعزیت کی اور بیگم نسیم ولی اور اسفند یار ولی کیساتھ فاتحہ خوانی کی۔

☆☆☆☆☆

شیخ رشید احمد نے خواہش ظاہر کی کاش میری عمر مجید نظامی کو لگ جائے کیونکہ کشمیر، آبی ذخائر، جمہوری آزاد، پریس کی آزادی اور کلچر پر حملہ آور ہونے والی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما مجید نظامی کلمہ حق بلند کر رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

گورنر پنجاب جنرل خالد مقبول نے روزنامہ نوائے اور دی نیشن کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی کو ''مین آف کمٹمنٹ'' اور ''مین آف آئیڈیا'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ بعض ایشوز پر اختلاف ہونے کے باوجود وہ ہمارے لئے اثاثہ ہیں۔ میں ان سے ملاقات کا خواہشمند ہوں۔

☆☆☆☆☆

مشائخ کی جانب سے منعقدہ تقریب میں پیر کبیر علی شاہ کی طرف سے محترم مجید نظامی کو 50 تولہ چاندی کا قلم اور 66 تولہ چاندی کی تلوار پیش کی گئی۔ اس موقع پر مجید نظامی نے کہا کہ قلم، قلم بھی ہے اور تلوار بھی، میں اس قلم کو تلوار ہی سمجھوں گا اور ملک میں اسلام کے نفاذ کیلئے آخری سانس تک کوشش کرتا رہوں گا۔

☆☆☆☆

صدر محفل مدینہ منورہ سے آئے ہوئے صاحبزادہ ڈاکٹر پروفیسر محمد عاصم جان مجددی سرہندی نے اس موقعہ پر کہا کہ مجید نظامی نے اپنے نام کے لغوی معنوں کو مکمل طور پر عملی جامہ پہنایا ہے۔ ''نظامی'' کا ایک مطلب بہترین فائٹر ہے اس طرح ''مجید'' کا مطلب بھی ظالم کے خلاف جہاد کرنیوالے کو کہا جاتا ہے۔ اس طرح مجید نظامی اپنے عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ ہر لحاظ سے بہترین فائٹر ہیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے والدین کے نام کو بھی جلا بخشی ہے۔

☆☆☆☆

عارف نظامی نے کہا کہ مجید نظامی میرے لیے رہبر و راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔
عارف نظامی گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ والد محترم حمید نظامی کی وفات کے وقت میں چند برس کا تھا۔ والدہ محترمہ نے بنیادی تعلیم و تربیت کو پایہ تکمیل پہنچانے میں اپنا فریضہ

ادا کیا لیکن زندگی کے باقی مراحل میں مجید نظامی نے ہمیشہ راہنمائی فرمائی۔ تعلیمی مدارج طے کرنے سے لے کر عملی زندگی کے آغاز تک تمام فیصلوں میں وہ ہمارے لیے مددگار رہے اور کسی بھی اوراخباری مالکان کی طرح ہمیں یہ سہولت نہیں دی کہ بغیر تعلیمی مراحل طے کیے ہم ادارے کے نظم و نسق سنبھالنے کے خود کو اہل سمجھیں۔ لہٰذا میں نے زمانہ طالب علمی سے عملی طور پر اخبار کے دفتر میں کام کرنے کا آغاز کیا پھر ایم اے ماس کمیونیکیشن میں ڈگری بھی حاصل کی۔ مجید نظامی بااصول شخصیت ہے لہٰذا سخت گیر باس ہیں۔ عارف نظامی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ خدا انہیں والد محترم اور مجید نظامی کے بنائے ہوئے اصولوں کی پاسداری کے لیے کمر بستہ رکھے اور ہم اسلام، نظریہ پاکستان اور جمہوریت کے مستقل قیام کے لیے کوششیں کرتے رہیں۔

مکتوب لندن

(لندن سے مجید نظامی کے دسمبر 1954 میں لکھے گئے مکتوبات)

☆......سیاست کی سرگرمی

☆......مولانا بھاشانی

☆......پکڈلی

☆......سیاست کی گرمی

(نوائے وقت کے نمائندہ خصوصی مقیم لندن مجید نظامی کے قلم سے)

سیاست کی سرگرمی

لندن میں موسم جس قدر سرد ہے سیاست اسی قدر گرم ہے ہاؤس آف کامنز کا اجلاس جاری رہے کل وہاں کافی گرماگرمی ہوئی موضوع زیر بحث ''مانٹی'' (فیلڈ مارشل منٹگمری تھا) آپ کو یاد ہوگا۔ برطانیہ کے اسی سالہ گھاگ وزیراعظم نے خبر نہیں کسی ۔۔۔۔۔میں اپنے ووٹروں کے حلقہ میں تقریر کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ جب گزشتہ جنگ کے آخری دنوں میں جرمن ہتھیار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے تو میں مانٹی کو تار دیا تھا کہ وہ ان ہتھیاروں کو سنبھال کر رکھے ممکن ہے ہمیں روسیوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے انہیں جرمنوں کو واپس کرنا پڑے۔

''مانٹی'' نے رپورٹروں کے سامنے نہ صرف یہ تسلیم کرلیا کہ انہیں ایسا تار دیا تھا بلکہ اپنے کاغذات میں سے اسے تلاش کرنے کا بھی وعدہ کرلیا۔

لیبر والوں نے اس پر بہت شور مچایا ہے اور رائے عامہ کو چرچل کے خلاف کر دیا ہے ایک مشہور اخبار نے لکھا ہے کہ یہ حرکت اس وقت ہی بری تھی۔ چہ جائیکہ اب اس کا ذکر کیا جائے۔ آخر مسٹر چرچل کو کیا حاصل ہوا ہے؟

کل ہاؤس آف کامنز میں وقفہ سوالات میں ایک لیبر ایم پی نے وزیراعظم سے پوچھا کہ کیا حکومت ''مانٹی'' پر سرکاری ملازمت چھوڑنے کے بعد (فیلڈ مارشل منٹگمری آجکل ''نیٹو'' کے سپریم کمانڈر ہیں) ایک اہم خفیہ دستاویز اپنے قبضے میں رکھنے کے الزام میں مقدمہ چلانے کا ارادہ

رکھتی ہے؟

مسٹر چرچل نے اس کا جواب نفی میں دیا۔لیکن پندرہ بیس منٹ تک ہاؤس میں خوب ہنگامہ آرائی ہوئی۔ جسے دیکھنے اور سننے کے لیے ''مانٹی'' بنفس نفیس سپیکر کے سامنے تماشائیوں کی گیلری میں تشریف فرما تھے۔مسٹر چرچل یہ بات کہہ کر ضرور پریشان ہو رہے ہونگے لیکن یہاں کے سیاسی حلقے اس حقیقت پر شرم محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے آزمودکار لیڈر کے ذہن میں نازیوں کے ساتھ اینٹرا و مالوٹوف معاہدے سے بھی زیادہ شرمناک معاہدہ کا پلان موجود تھا۔

مولانا بھاشانی

مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے رہنما مدت سے لندن میں بغرض علاج مقیم ہیں۔دعا کریں خدا انہیں جلد از جلد شفا بخشے............آج شام جب میں ان سے ملنے گیا تو وہ چست گرم انڈر ویر پر سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے تھے ان کے پاؤں ......جو جرابوں سے بے نیاز تھے۔ میں کھڑاؤں نما کالی چپل تھی۔ان کی کھچڑی داڑھی تین اطراف کانوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

کمرے کے درمیان چھوٹی سی تپائی پر مصر کی اخوان المسلمون کے بارے میں ان کے بیان کی سائیکلوسٹائل کاپیاں پڑی تھی۔ کمرے میں ایک دو نوجوان بیٹھے تھے............جن کے بارے میں ایک معتبر اخبار نویس دوست کا کہنا ہے کہ کمیونسٹ لونڈے ہیں'' مولانا نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔نوجوان ''نوائے وقت'' کا نام سن کر باہر چلے گئے'اور مولانا نے اچھی خاصی اردو میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دل کھول کر باتیں کیں انہوں نے کہا کہ وہ ہرگز کمیونسٹ نہیں ہیں وہ اسلام کے سچے شیدائی ہیں اور خلفائے راشدین کے اسلام کو پاکستان میں واپس لانا چاہتے ہیں انہوں نے کہا کہ وہ مشرقی پاکستان میں زمینداروں کو معاوضہ ختم کر کے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کرنے کے حامی ہیں۔

آپ نے پاکستان واپس جانے کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ کم سے کم دسمبر میں تو واپس نہیں جائیں گے فی الحال وہ مسٹر سہروردی کے بلاوے کا انتظار

کریں گے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ پاکستان کے استحکام و بہبود کی خاطر اگر مسٹر سہروردی نے برسر اقتدار گروہ سے کوئی سمجھوتہ کر لیا تو وہ ان کا ساتھ دیں گے بشرطیکہ ہماری شرائط:

1۔ مشرقی بنگال میں پارلیمانی حکومت کی بحالی

2۔ سیاسی قیدیوں کی رہائی (ان میں مجرمان پنڈی سازش کیس" شامل نہیں ہیں) اور

3۔ جلد سے جلد عام انتخابات تسلیم کر لی جائیں

مولانا نے از خود بتایا کہ جب وہ لندن تشریف لائے تھے تو ان کے پاس تیس پونڈ تھے جو کسی دوست نے کپڑے خرید کر ختم کر دیئے لیکن لندن میں ہزاروں بنگالی مسلمان ہیں کوئی انہیں کرتہ بنا کر دے جاتا ہے اور کوئی پاجامہ کوئی کھانا دے رہا ہے تو کوئی مکان کا کرایہ ادا کر رہا ہے وہ جتنا عرصہ چاہیں لندن میں ٹھہر سکتے ہیں اپنے مستقبل کے پروگرام کے بارے میں اٹھاون سالہ مولانا نے کہا کہ پاکستان میں برسر اقتدار گروہ جب تک میرے مطالبات منظور نہیں کرتا۔ میں "لڑائی" جاری رکھوں گا۔

مولانا "لڑائی" کے اس قدر شوقین ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ اب بھی تمام لیڈروں کو کراچی میں اکٹھے ہو کر آٹھ، دس دن، پندرہ دن لڑنے جھگڑنے اور اپنی اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں تسلیم کرنے کے بعد کسی پروگرام پر متفق ہونا چاہیے اور اس عملی جامہ پہنانے کے لیے پھر لڑنا چاہیے۔

پکڈلی

پکڈلی لندن کا مشہور علاقہ ہی نہیں دل بھی ہے۔ یہاں کی دکانیں اپنے بزنس اور چوک "کاروبار حسن" کے لئے مشہور ہے۔ یہاں سر شام "حسن" بن سنور کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ راہ جاتے "عشق" سے خود کہتا ہے "ہیلو ہینڈسم، وانٹ اے گڈ ٹائم؟ تھری پاؤنڈز اونلی" (ہیلو خوبرو!

اچھا وقت گزارنے چاہتے ہو صرف تین پاؤنڈ!)

اس ''سودا بازی'' کے بارے میں کل ہی پارلیمنٹ میں ایک رکن نے ہوم سیکرٹری سے پوچھا تھا کہ پولیس کیا کر رہی ہے اور اس نے جواب دیا تھا کہ پولیس کے بس میں جو کچھ ہے کر رہی ہے۔

لیکن لندن کے اس کاروبار کو لندن کی مستعد پولیس بھی نہیں بند کر سکتی۔ لندن میں یہ عورت کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس لندن میں جہاں لاکھوں نوجوان لڑکیوں کو نا صرف خود کمانا پڑتا ہے بلکہ شوہر کی بھی تلاش کرنا پڑتی ہے اور تلاش کے باوجود اکثریت کو شوہر میسر نہیں آتا۔ بہر حال برطانوی حکومت اس آمدنی پر سیل ٹیکس سے محروم ہے۔ ممکن ہے انکم ٹیکس والے کیش کی بجائے ''کائنڈ'' میں لیتے ہوں۔ آخر انکم ٹیکس والے ہیں لاہور کے ہوں یا لندن کے!

☆☆☆☆☆☆☆☆

دسمبر 1954

☆......اندھا دکاندار لٹ گیا

☆......پانچ بچوں کی ماں کو سزا

☆......ایک کروڑ جرمانہ

☆......چھپر پھاڑ کر

☆......ہیرا جہانگیر

☆......تاریک خالی

☆......پامسٹ ہوشیار رہیں

☆......اصلاح اسیران

(نوائے وقت کے نمائندہ خصوصی مقیم لندن مجید نظامی کے قلم سے)

اندھا دکاندار لٹ گیا

ان میں شراب زنا اور جوئے کو عیب نہیں سمجھا جاتا لیکن بے ایمانی سے بدتر یہاں کوئی گناہ نہیں۔ اخبار فروش بنڈل چوراہوں میں رکھ جاتے ہیں قارئین ڈبے میں مقررہ رقم ڈالتے ہیں اور اپنا اخبار اٹھا کر چلتے بنتے ہیں۔ پاکستان میں ہو تو پہلے ہی دن کوئی صاحب بنڈل کا بنڈل اٹھا کر لے جائیں اور ردی میں فروخت کر دیں۔ کوئی ڈبہ جیب میں ڈال کر چلتا بنے۔ بنک میں آپ کا اکاؤنٹ ہے کاؤنٹر پر اپنا چیک پیش کیجئے۔ نصف منٹ کے اندر آپ کو رقم مل جائے گی۔ کوئی نہیں دیکھتا دستخط درست ہیں یا نہیں بنک میں آپ کے حساب میں رقم بھی ہے یا نہیں ہیں۔ اگر پاکستان میں ایسا ہو تو ایک ہفتے کے اندر اندر تمام بنک بند ہو جائیں لیکن اس لندن میں کسی شریف آدمی نے ایک اندھے بوڑھے سگرٹ فروش کی دکان کا صفایا کر دیا اور وہ بھی اس کی سالگرہ کے موقع پر اندھا اپنی انیسویں سالگرہ منا رہا تھا اور چور اس کے تین ہزار کے سگریٹ اڑا کر چلتا بنا۔

پانچ بچوں کی ماں کو سزا

آپ نے لاہور میں پڑھا ہوگا۔ ایک خاتون محترمہ اپنے برقعہ میں ''آنکھ کا نشہ'' یا ''تیری میری'' ''یا'' دل کی پیاس'' کا تھان چوری کرتے ہوئے پکڑی گئیں ایک اور محترمہ اپنے برقعہ میں سینڈلوں کو چھپاتے ہوئے انارکلی میں پکڑی گئی یہاں بھی برسٹل میں پانچ بچوں کی ایک ماں کو ڈیڑھ سو روپے کی مختلف اشیاء چوری کرتے ہوئے گرفتار ہوئی ہیں یہ سب تحائف کرسمس کے لیے تھے۔ لاہور میں تو دوکانداروں کے دل معافی پر پسیج جاتے ہیں لیکن برسٹل کے صاحب دکانداروں نے میم صاحبہ کو ایک ماہ کے لیے سرکاری مہمان بنوا دیا ہے۔

ایک کروڑ روپیہ جرمانہ

یہاں کے ایک جہاز ران کمپنی کے مالک مسٹر ارسٹائل نے جنوبی امریکہ میں اپنے بینکر کو ہدایت دی ہے کہ وہ حکومت پیرو کو ایک کروڑ روپیہ کی رقم بطور جرمانہ ادا کر دے حکومت پیرو نے یہ جرمانہ مسٹر ارسٹائل کو پانچ جہازوں کو پیرو کے پانیوں کی حدود میں داخل ہونے پر کیا تھا یہ جہاز ابھی تک پیرو لیول کی زیر نگرانی کھڑے ہیں

چھپر پھاڑ کر

آپ نے سنا ہوگا خدا جب دینے پر آتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے یہاں GOD نے بھی ایک پوسٹ مین کو ROOF پھاڑ کر دیا ہے ایک 76 سالہ بوڑھا اپنی موت پر ستر لاکھ سے زیادہ روپیہ چھوڑ گیا ہے۔ وصیت کے مطابق اس پوسٹ مین کو بھی اس رقم میں سے حصہ ملے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے وارے نیارے ہو رہے ہیں ان میں سے اکثر نے مرنے والے بڈھے کو نہیں دیکھا تھا اور نہ بڈھے نے اپنی زندگی میں ان کی شکل دیکھی تھی۔ بڈھا مرنے سے پہلے وصیت پر دستخط بھی نہیں کر گیا تھا اس موقع ایک واقعہ سن لیجئے جو ایک دوست نے یہ خبر سن کر سنایا ہے وہ راوی ہیں کہ کچھ عرصہ یہاں ایک پاکستانی نوجوان اللہ کو پیارے ہو گئے بنک میں ان کی کافی رقم تھی ان کے والد بذریعہ ہوائی جہاز لاش لینے آئے اور جانے سے پہلے بنک میں جا کر انہوں نے کہا کہ میں فلاں کا باپ ہوں وہ مر گیا ہے اس کی رقم مجھے دی جائے بنک والوں نے دوسری بات تک نہ کی اور اسکا اکاؤنٹ دیکھ کر دومنٹ کے اندر اندر رقم ان کے حوالے کر دی۔

ہیرا جہانگیر

کلکتہ کسٹم والوں نے مہاراجہ اور کلکتہ کے ایک جیولر کو 55-75 ہزار روپے جرمانہ کیا ہے مہاراجہ پرودان نے اک فرم کی معرفت ہیرا جہانگیر جن کا وزن 83 قیراط اور قیمت کوئی ستر ہزار روپے تھی کسٹم والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لندن بھیج دیا تھا یہاں وہ قریباً ایک لاکھ تیس ہزار روپے میں نیلام ہوا تھا یہ ہیرا جو پشت ہا پشت سے مہاراجگان کی ملکیت تھا کسی وقت دہلی کے مغل شہنشاہ کے تخت کے مور کی کلغی میں جگمگایا کرتا تھا اور اس پر یہ الفاظ کندہ تھے جہانگیر 1021 پسر اکبر شہنشاہ۔

تاریک خیالی

ہمارے ہاں روشن خیال حضرات کا کہنا ہے کہ معاشرے کے جنسی مسائل کا واحد حل مخلوط تعلیم اور مخلوط میل جول ہے لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ خود مغرب والے اپنی اس اختراع سے

عاجز آچکے ہیں۔ چنانچہ کل یہاں نوجوانوں کی ایک مخلوط کلب میں تقریر کرتے ہوئے ایک مجسٹریٹ اور عہدیدار نیشنل ایسوسی ایشن آف بوائز کلب نے کہا ہے کہ سولہ سال سے کم عمر کے بچوں پر اس سے زیادہ ظلم نہیں ہوسکتا کہ وہ مخلوط کلبوں کے رکن ہوں۔ انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ لڑکوں کو لڑکیوں پر قربان نہیں کیا جاسکتا انہیں مرد بننا ہے اور مردانہ کام کرنے چاہئیں مثلاً وہ لڑکیوں کے پیچھے پھرنے یا ان کی طرح محفلوں میں بیٹھنے کی بجائے فٹ بال کھیلیں یا دوسری کھیلوں میں حصہ لیں۔

پامسٹ ہوشیار رہیں

یروشلم کی ایک قسمت بتانے والی جپسی ''خانہ'' بدوش عورت کو ایک مجسٹریٹ نے فراڈ کے الزام میں چودہ دن قید کی سزا دی ہے مجسٹریٹ نے اس سے پوچھا تھا کہ تم جو سارے جہاں کو قسمت بتاتی پھرتی ہو تمہیں یہ پتہ نہیں چلا تھا پولیس تمہیں پکڑنے والی ہے اور میں تمہیں سزا دینے والا ہوں۔

تاش کے پتوں کی مدد سے قسمت بنانے والی جپسی نے اعتراف کیا کہ یہ معلوم کرنے کا اس کے پاس کوئی طریقہ نہیں تھا۔ خدا ٹمپل روڈ کے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے نجومیوں اور اخبارات میں اشتہارات چھپوانے والے پروفیسر حضرات کو پنجاب پولیس کی زد سے محفوظ رکھے۔

اصلاح اسیران

پاکستان میں جیلوں کی اصلاح کے لیے بہت کچھ ہو رہا ہے لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ بھی نہیں ضروری نہیں کہ اگر کوئی اپنی کمزوری یا کسی غلطی کی وجہ سے جیل چلا جائے اور بعض اوقات بے قصور بھی جیل پہنچ جاتے ہیں تو اسے ایسا مزا چکھایا جائے کہ ساری عمر یاد رکھے قیدی بھی آخر انسان ہوتے ہیں اور ان سے انسانوں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔ یہاں کی جیلیں ہمارے بعض گھروں کے مقابلے میں ''جنت'' ہیں اور ان کی اصلاح کے لیے مدتوں سے بہت کچھ ہو رہا ہے۔ آج میں نے پڑھا ہے کہ کل رات یہاں میڈسٹون جیل میں ٹیلی ویژن کی ''مضبوط لڑکی'' مس

جون نے تین سو قیدیوں کے سامنے لوہے کی سلاخوں کو دوہرا کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ لندن ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ایک جلد کے تمام صفحات کو بیک وقت پھاڑا۔ قیدیوں نے اس سے گانے سنے اور گریسی کول اور ان کی لڑکیوں کے بینڈ سے میوزک۔

پنجاب کی جیلوں (اگر پاکستان نہیں) میں بھی قیدیوں کی تفریح کے لیے کچھ ہفتہ وار یا ماہانہ پروگرام ہونے چاہئیں ضروری نہیں کہ انہیں اختری بائی یا جمیلہ اختر کے گانے ہی سنائے جائیں اور آشا پوسلے کے ناچ دکھائے جائیں۔



دسمبر 1954

☆...... بڑھاپے کی شادیاں

☆...... بین الاقوامی مسئلہ

☆...... کرایا نہیں مکان چاہیے

☆...... پارلیمنٹ کا رکن

☆...... بیگمات اپوا کی توجہ کے لئے

☆...... مسز پنڈت کی آمد

(نوائے وقت کے نمائندہ خصوصی مسٹر مجید نظامی مقیم لندن کے قلم سے)

بڑھاپے کی شادیاں

ہمارے نواب زمیندار اور سیٹھ بڑھاپے میں شادی رچانے کی وجہ سے خواہ مخواہ بدنام ہیں۔ حالانکہ یہاں صاحب بہادر ستر ستر اسی اسی سال کی عمر میں نہ صرف بیاہ رچاتے ہیں بلکہ اس سے پہلے معاشقے بھی لڑاتے ہیں۔ ان میں سیاستدان، نواب...... اور لاکھ پتی بوڑھی دوشیزائیں بھی شامل ہیں۔

برطانوی دارالعلوم میں حزب اختلاف کے ڈپٹی لیڈر اور اٹیلی وزارت کے نائب

وزیراعظم ۴۶ سالہ مسٹر ہربرٹ مارےسن ۶ جنوری ۵۵ء کو ۴۷ سالہ مس ریڈتھ سے شادی کر رہے ہیں۔ مس ریڈتھ سے آپ کی ملاقات چار ماہ پہلے سوئٹزرلینڈ کے ایک گاف کلب میں ہوئی تھی۔ کل مسٹر ماریسن نے ایک دعوت میں بتایا کہ اب وہ دعوتوں میں آتے ہوئے شرماتے ہیں۔ یاد رہے ماریسن بے چارے سترہ ماہ سے رنڈوے چلے آ رہے ہیں۔ آپ نے پہلی شادی ۱۹۱۹ء میں کی تھی۔

کل شام ۶۸ سالہ کنواری دوشیزہ مس سیڈلر کینٹ میں اپنے چھ کمروں پر مشتمل خوبصورت مکان میں عروسی جوڑہ زیب تن کئے اپنی دو ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ آتش دان کے قریب افسردہ بیٹھی تھی۔ کمرہ نہایت سجا ہوا تھا اور درمیان میں میز پر شادی کے کیک کے علاوہ انواع واقسام کی مٹھائیاں پڑی تھیں۔

کل شام مس سیڈلر اپنے ۴۸ سالہ مالی جان سے شادی رچانے والی تھی۔ تمام تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ ۵۰ مہمانوں کو دعوتی کارڈ بھیجے جا چکے تھے۔ شادی میں چند گھنٹے باقی تھے کہ...... مس سیڈلر اور مسٹر جان نے بستی کے لوگوں کے طعنوں اور چہ مگوئیوں سے تنگ آ کر شادی خانہ آبادی کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا ہے...... اور مسٹر جان پرنم آنکھوں اور بھاری دل کے ساتھ اپنے گاؤں اپنی ۷۷ سالہ ماں کے ہاں چلے گئے...... مس سیڈلر نے عروسی جوڑہ پہنے ہوئے اخبار نویسوں کو بتایا کہ وہ اور مسٹر جان ایک دوسرے پر فدا ہیں انہوں نے 'ہنی مون' منانے کا دلچسپ پروگرام بنا رکھا تھا لیکن تنگدل بلکہ سنگدل دنیا نے رنگ میں بھنگ ڈال دی ہے...... خیر اب ہم چند ماہ بعد جان کے گاؤں میں شادی کریں گے۔

غمزدہ مس سیڈلر کو اس کی سہیلیاں اپنے ساتھ لے گئی ہیں تا کہ اس کے کرسمس کا مزہ کرکرانہ ہو جائے۔ لندن کی ایک خبر ہے کہ کل ۷۷ سالہ نواب سر کنتھ کرا سلے نے اپنی ۴۲ سالہ سیکرٹری مس الزبتھ جائس سے شادی کر لی۔

بین الاقوامی مسئلہ

کل لندن کی آکسفورڈ سٹریٹ کے ایک سٹور میں بیس سالہ ماں اپنا چھ ماہ کا بچہ چھوڑ گئی ہے بچے کے کوٹ ساتھ اس مضمون کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ میں اپنے بچے کے لیے کوئی گھر تلاش نہیں کر سکی۔ براہ کرم اسے گھر میں رکھئے تا کہ یہ کرسمس اچھا گزار سکے ننھا منا اب لندن کونٹی کونسل کی نرسری میں ہے اور پولیس اس کی ماں کی تلاش میں ہے۔

گڑیا نہیں مکان چاہئے

لندن میں جہاں ایک اندازے کے مطابق کم وبیش 95 لاکھ نفس رہتے ہیں، رہائشی مکانوں کی بے حد کمی ہے، ادھر صحت کے ایسے قوانین نافذ ہیں کہ ایک کمرہ میں مقررہ تعداد سے زیادہ لوگوں کا رہنا سہنا جرم ہے............ایک پانچ سالہ بچی نے فرضی "کرسمس فادر" کے نام اس مضمون کا خط لکھ کر یہاں کے اخباروں کو چونکا دیا۔

ڈئیر فادر کرسمس !

مجھے کرسمس پر گڑیا یا مٹھائیوں کی ضرورت نہیں، کیا تم ہمارے ڈیڈی اور ممی کو ایک گھر نہیں دے سکتے۔ بہت سے پیار کے ساتھ۔

سی ۔ وائٹ

پانچ سالہ کرسٹائن اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ چار سال سے بورڈنگ میں رہ رہی ہے اور اس دوران میں انہوں نے ایک کرسمس بھی گھر پر نہیں گزارا......اس سال جب ان کی سپرنٹنڈنٹ نے بچوں اور بچیوں سے کہا کہ وہ "فادر کرسمس" کے نام خط لکھ کر اپنی اپنی خواہشات کا اظہار کریں تو ننھی کرسٹی نے گڑیا یا مٹھائی کی بجائے......مکان......مانگا

ڈاکخانہ والوں نے "فادر کرسمس" کے نام کا یہ خط لندن "کاؤنٹی کونسل" کو بھیج دیا اور انہوں نے بے معنی سمجھتے ہوئے ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کی بجائے پولیس کے سپرد کر دیا اور کہا کہ مکتوب نگار کا کھوج لگایا جائے اور لندن کی مستعد پولیس نے گھنٹوں کی کاوش کے بعد بالآخر پانچ

سالہ کرسٹی کا کھوج نکال لیا...... دیکھیں اب ''فادر کرسمس'' اسے اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنے کے لئے گھر دیتا ہے یا نہیں۔

پارلیمنٹ کا رکن

لندن کاؤنٹی کونسل برطانوی پارلیمنٹ کے ٹوری ممبر (برسر اقتدار گروپ) مسٹر ہنری پرائس کا مکان پانچ دوسرے مکانوں کے سمیت گرا رہی ہے تاکہ اس جگہ ۱۰۰ نئے مکانات بنا لئے جائیں۔

کل جب مسٹر پرائس سے پوچھا گیا کہ آپ کو اس سے کوفت نہیں ہوگی! جہاں اب چھ کنبے رہتے ہیں۔ وہاں کچھ عرصے بعد ۱۰۰ رہیں گے۔ میں نیا مکان تلاش کر رہا ہوں۔ ذرا اپنے ارکان اسمبلی سے اس کا مقابلہ کیجئے۔

بیگمات اپوا کی توجہ کے لئے

برطانوی وزیر نوآبادیات مسٹر ایلین بائنڈ کی بیگم لیڈی پیٹریشیا بائنڈ بہرے بچوں کے لئے ٹیکنیکل سکول کھول رہی ہیں۔ سکول کے عمارت انہوں نے اپنے باپ لارڈ آئیوگ سے حاصل کی ہے۔

لیڈی پیٹریشیا جو ۱۳ اور ۱۵ سالہ دو بیٹوں کی ماں ہیں۔ کچھ عرصے سے بہرے بچوں کی بہبودی میں دلچسپی لے رہی ہیں۔ اس سکول میں فی الحال ۳۰ طلبا کی زبانی تعلیم کا انتظام ہوگا بعد میں یہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لے سکیں گے۔

مسز پنڈت کی آمد

برطانیہ میں بھارت کی پہلی ''دیوی راج دھوت'' اور ملکہ کے دربار کی پہلی خاتون سفیر مسز وجے لکشمی پنڈت (۱۹ دسمبر) لندن پہنچ گئی ہیں۔ مسز پنڈت کا جہاز پیرس میں دھند کی وجہ سے رکے بغیر وقت مقررہ سے دو گھنٹے پہلے لندن کے ہوائی اڈا پر پہنچ گیا جس کی وجہ سے آپ کے استقبال میں کافی گڑبڑ ہوئی اور بھارتی سفارت خانہ کے سٹاف کے علاوہ ان کے اکثر ''درشن

ابھلاشیوں'' کو بھی پریشان ہونا پڑا...... پنڈت نہرو کی ۵۴ سالہ بہن مسز پنڈت اس سے پہلے جنرل اسمبلی کی صدر اور ماسکو اور اقوام متحدہ میں بھارتی راج دھوت رہ چکی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

25 دسمبر 1954

☆......لندن کا موسم

☆......شادی کا ارمان

☆......امریکہ کے ٹیلی فون

☆......نکما باپ

☆......خدا دینے پر

☆......ایوا گارڈنر

☆......ملاپ

(نمائندہ خصوصی مقیم لندن مسٹر مجید نظامی کے قلم سے)

لندن کا موسم

کل رات (۲۵ دسمبر) لندن میں موسم سرما کی سب سے زیادہ دھند پڑی۔ پانچ فٹ کے فاصلے پر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اکثر ''اہل کار'' حضرات اپنی کاریں سڑکوں پر چھوڑ کر پیدل گھر گئے۔ لندم میں ''بڈھوں کے کلب'' کے ڈیڑھ سو کے قریب ارکان (سب کی عمریں ساٹھ سال سے اوپر تھیں) کو کلب میں ہی سونا پڑا۔

دھند سے چوروں اور قاتلوں نے بھی فائدہ اٹھایا کنزنگٹن کے علاقہ میں ایک چونتیس سالہ عورت کو کسی نے اسی کے کمرے میں قتل کر دیا۔ ایک چور نے ایک دکان کا شیشہ توڑ کر کوئی ڈیڑھ لاکھ روپے کے سگریٹ اڑا لئے۔ لندن پولیس کے چیف کے بڑے بھائی کے ہاں بھی کسی

نے نقب لگالی۔ایک اور جگہ چوروں نے کھڑکی کے راستے داخل ہو کر سات ہزار کے جواہرات چرالئے۔ایک ''ہونے والی ماں'' کو گھر سے ہسپتال تک چند میل کا راستہ ایمبولینس میں پانچ گھنٹے میں طے کرنا پڑا۔غریب شوہر ایمبولینس کے آگے پیدل جا رہا تھا۔

نوٹ: مکتوب لندن میں روپے کو پونڈ پڑھا جائے۔

شادی کا ارمان

لندن کی دو لڑکیوں کو آپس میں ''شادی'' کرنے کے الزام میں پچیس پچیس پونڈ کی سزا ہوئی ہے۔دلہن کی عمر ۲۱ سال ہے اور ''دولہا'' کی ۲۶ سال وہ ۱۹۵۰ء سے رفاقت نباہ رہی تھیں کہ ۵ ستمبر ۱۹۵۴ء کو انہوں نے گرجے میں جا کر شادی کر لی۔''دولہے'' نے بال کٹوا رکھے تھے اور کوٹ پتلون پر اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔اس وقت سے وہ ایک فلیٹ میں ''میاں بیوی'' کی طرح رہ رہے تھے کہ پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔

''دولہا'' اور ''دلہن'' دونوں نے اقبال جرم کر لیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور آئندہ بھی ''میاں بیوی'' کی طرح ہی رہیں گے۔دلہن کا کہنا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کو اسی طرح اپنا ''سرتاج'' سمجھتی ہے۔جس طرح کوئی اور شادی شدہ عورت اور دونوں اب ''شوہر'' کا ڈنمارک میں اوپریشن کروانے کے لئے پیسے بچا رہے ہیں۔دلہن کو یقین ہے کہ اس کے بعد اس کے میاں کی جنس تبدیل ہو جائے گی۔حالانکہ لندن کے ڈاکٹر عرصہ ہوا اسے جواب دے چکے ہیں...... ''شوہر'' کے جسم اور ٹانگوں پر مردوں کی طرح بال ہیں یورپ اور برطانیہ میں جنگوں کی وجہ سے مردوں کی بے حد کمی ہے۔اکثر دوشیزائیں شادی کا ارمان دل میں لئے ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔کوئی عجب نہیں اس خبر کی اشاعت کے بعد لڑکیاں محض تسکین کی خاطر آپس میں شادیاں شروع کر دیں۔

امریکہ کے ٹیلی فون

امریکہ میں اس وقت دنیا کے نصف سے زیادہ یعنی ۸۹،۰۰۰،۰۰۰ ٹیلی فون ہیں۔اس

وقت ہر پار اامریکیوں کے پاس ایک ٹیلی فون ہے۔ برطانیہ میں اس وقت ۲۱۰۷۰۰۰ یعنی ہر آٹھ اشخاص کے پاس ایک فون ہے۔لیکن ۔۔۔۔ میں برطانیہ والوں کی غربت یا کنجوسی کو دخل حاصل نہیں۔ برطانیہ میں فون حکومت دیتی ہے۔امریکہ میں ٹیلی فون پرائیویٹ کمپنیاں چلاتی ہیں۔

نکما باپ

شفیلڈ کے پچیس سالہ ہیری فراسٹ کو جب پولیس نے گرفتار کیا تو وہ آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلائے بڑے مزے سے ریڈیو سن رہا تھا۔عدالت نے اسے جان بوجھ کر بیکار رہنے اور بیوی بچوں کی طرف توجہ نہ دینے کے الزام میں چھ ماہ قید کی سزا دی ہے۔مسز فراسٹ نے عدالت کو بتایا کہ اس کا شوہر کوئی کام کرنے پر راضی نہیں وہ سارا دن ریڈیو سنتا رہتا ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھتا ہے اور شام کو سینما یا تھیٹر چلا جاتا ہے۔پچیس سالہ ہیری نے کام کرنے سے صاف انکار کر دیا اور چھ ماہ کے لئے جیل جانا منظور کر لیا کہ وہاں بھی روٹی تو مفت توڑے گا۔

خدا دینے پر............

سرے کے 74 سالہ بوڑھے موچی کو" گاڈ" نے چھت پھاڑ کر 75 ہزار پاؤنڈ دیئے ہیں اس نے چھ پنس کا ایک ٹکٹ خریدا تھا۔

ایوا گارڈنر کی معذرت

مشہور امریکی ممثلہ ایوا گارڈنر نے ہانگ کانگ میں معذرت کی ہے کہ اس نے اپنے قیام ہانگ کانگ کے دوران دو دعوتیں نامنظور کر دی تھیں۔ایک دعوت ہانگ کانگ کے گورنر کی طرف سے دوپہر کے کھانے کی اور دوسری امریکی قونصل جنرل کی طرف سے کاک ٹیل پارٹی کی تھی۔

"ملاپ"

ہالی وڈ کی اداکارہ میری میکڈانلڈ اور اس کے "مطلق شوہر" ہیرلی کارل پانچ مختلف ملکوں میں دوبارہ شادی کرنے کی ناکام کوشش کے بعد نیویارک واپس پہنچ گئے ہیں ہیرلی نے بتایا ہے کہ وہ فرانس سوئٹزرلینڈ لیسمبین سٹائن اور نھیبر میں اس لئے شادی نہ کر سکے کہ ان کے پاس

ضروری کاغذات نہیں تھے۔ برطانیہ میں انہیں بتایا گیا کہ دوبارہ شادی رچانا فضول ہے کیونکہ وہاں ان کی نوردہ (امریکی ریاست) کو قانونی درجہ حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اب انہوں نے کیلی فورنیا میں شادی کرلی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

31 دسمبر 1954

☆......ایٹمی جنگ

☆......قبرص کا مسئلہ

☆ ریلوے مزدوروں کی ہڑتال

(نمائندہ خصوصی مقیم لندن مسٹر مجید نظامی کے قلم سے)

ایٹمی جنگ

یہاں کے اخبار پڑھنے کے بعد انسان اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ''کیا ایٹمی جنگ شروع ہونے والی ہے''؟۔ پچھلے ہفتے پیرس میں ''NATO'' کونسل کی میٹنگ کے بعد ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کی جنگ کی باتیں عام سننے میں آ رہی ہیں۔ روسی اور مغربی سیاست دانوں نے ...... عام قاعدے کے مطابق ...... امن کے لئے کبھی صدق دل سے کوشش نہیں کی۔ امن کے پردے کے پیچھے وہ ایٹم بموں اور ہائیڈروجن بموں کی تیاریوں میں مصروف رہے ہیں۔ اب جب کہ دونوں کے پاس ان بموں کی اتنی تعداد جمع ہوگئی ہے جو انسانیت کو نیست و نابود کرسکے تو انہوں نے پھر جنگ کی تیاریاں ...... دفاع کے پردے میں ...... اعلانیہ شروع کردی ہیں۔

''نیٹو'' کونسل کے رکن ۱۴ مغربی ممالک نہ صرف مغربی جرمنی کو دوبارہ مسلح کرنے پر متفق ہوگئے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے جرنیلوں کو ایٹمی جنگ اور ''دفاعی تیاریوں'' کا بھی حکم دے

دیا ہے۔لیکن ''بزن'' کا حکم دینے کا حق بدستور ''سیاست دانوں'' کے پاس ہی رہا ہے۔ جرنیل حکم ملتے ہی دنیا کو جہنم میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

روس نے فرانس کو نیٹو کونسل کی میٹنگ سے پہلے اور برطانیہ کو بعد میں دھمکی دی ہے کہ اگر انہوں نے نیٹو کونسل کی سفارشات منظور کر لیں تو روس ۱۹۴۲ء کے فرانسیسی روسی اور ۱۹۴۶ء کے برطانوی روسی معاہدوں کو کالعدم قرار دے دے گا کیونکہ وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ برطانیہ اور فرانس امریکہ کے ساتھ مل کر روس کے خلاف ''متحدہ محاذ'' بنا رہے ہیں اور جرمنی کو دوبارہ مسلح کر کے وہ متذکرہ معاہدوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

حسب توقع برطانیہ اور فرانس دونوں ان روسی یادداشتوں کو خاطر میں نہیں لائے اور انہوں نے روسی دھمکیوں کی پرواہ کئے بغیر امن کی راہ پر گامزن رہنے کا اعلان کیا ہے۔ روس جواب میں یقیناً اپنے الزام پر اصرار کرے گا۔ تلخی بڑھے گی ''سرد جنگ'' تیز ہوگی۔ تعلقات مزید کشیدہ ہوں گے اور کوئی عجب نہیں ''سرد جنگ'' توقع سے بہت پہلے ''گرم'' ہو جائے۔

ادھر یار لوگوں نے ایٹمی جنگ میں فتح اور شکست کی قیاس آرائیاں بھی شروع کر دی ہیں۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ فتح اس کے قدم چومے گی جو ایٹمی جنگ میں نہ صرف پہل کرے گا بلکہ دوسرے فریق کے بڑے بڑے ہوائی اڈوں اور ایٹمی ذخائر کو جلد سے جلد نیست و نابود کرنے کی کوشش کرے گا یعنی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ جنگ پہلی جنگوں کی طرح لمبی جنگ نہیں ہوگی۔ اس کا فیصلہ صرف تیس، اکتیس دن میں ہو جائے گا اور جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے اس جزیرے کا...... خدانخواستہ نام و نشان مٹنے میں بمشکل تیس ایک گھنٹے لگیں گے۔

اس جنگ میں بے شک نشانہ بڑے بڑے ہوائی اڈے بنیں گے لیکن گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ ان بڑے بڑے ہوائی اڈوں کے سوا جو ریگستانوں اور برفانی علاقوں میں ہیں کہاں شہری آبادی نہیں؟

کیا ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے بموں سے دس دس گنا زیادہ تباہ کن بموں کی بارش کے بعد یہ دنیا اس قابل رہے گی کہ بنی نوع انسان اس میں رہ سکے۔

مغربی ماہرین اس جنگ میں اپنی برتری کے جواز میں یہ دلائل پیش کر رہے ہیں۔

1۔ امریکی "بی 47" بمباروں کی تعداد "روسی نول جیٹ" بمباروں سے کہیں زیادہ ہے۔ان کی مشینری بہتر ہے اور وہ زیادہ دور تک مار کر سکتے ہیں۔اگلے سال "بی 52" بمباروں کے یونٹ کی تیاری مکمل ہو جائے گی۔اور وہ روس کے کسی مقام کو بھی نشانہ بنا سکیں گے۔اس کے برعکس روس کے پاس ایسے بمبار بہت کم ہیں جو نیویارک یا شکاگو کو نشانہ بنانے کے بعد واپس روس لوٹ سکیں...... برطانیہ بھی عہد حاضر کے بہترین بمباروں ویلیئنز اور وکٹرز سے لیس ہوگا۔

2۔ "ہوائی اڈوں" کے معاملے میں "مغرب" کو سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہے کہ امریکی ہوائی کمان کے صدر مقام اریزونا اور ٹیکساس روس کے کسی بھی فوجی ہتھیار کی زد سے دور ہیں۔روسی بمبار مشرقی جرمنی اور مشرقی ایشیا سے بھی ان مقامات پر حملہ کرنے کے لئے نہیں اڑ سکیں گے۔

اس کے برعکس امریکی بمبار جنوب مشرق ایشیا (بھارت اور چین) کے علاوہ روس پر بآسانی نہ صرف حملہ کر سکتے ہیں بلکہ فضا میں ہی برطانیہ فرانس، ترکی یا جاپان سے دوبارہ تیل بھی لے سکتے ہیں۔

3۔ مغربی "ماہرین" راکٹوں کے بارے میں بھی مغرب کی برتری کا دعوے کرتے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر ماسکو نے کبھی بھی جنگ کا "پنگا" لیا تو امریکہ اسے ناکوں چنے چبوا دے گا......لیکن اس بات کو سبھی تسلیم کر رہے ہیں کہ ایٹمی جنگ کی صورت میں یورپ اور برطانیہ کو کوئی طاقت تباہی و بربادی سے نہیں بچا سکتی اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج ہی برطانیہ نے اعلان کیا ہے کہ وہ روس اور امریکہ دونوں سے درخواست کرنے والا ہے کہ وہ ایٹمی تجربات کم کر دیں۔

قبرص کا مسئلہ

قبرص کا جزیرہ کافی عرصہ سے برطانیہ اور یونان کے درمیان نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ یونان اور برطانیہ یوں تو ''سمدھی'' ہیں (ملکہ برطانیہ کے شوہر شہزادہ فلپ یونانی ہیں) لیکن برطانیہ سیاست میں رشتہ داری کو دخل انداز نہیں ہونے دیتا چنانچہ یونان نے تنگ آ کر اس مسئلہ کو یو این او میں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن پچھلے ہفتے وہاں بھی ''منہ کی کھائی''۔ اس پر قبرص کے سکولوں کے ''یونانی لونڈوں'' گلی کوچوں میں وہ ''طوفان بدتمیزی'' مچایا کہ پولیس کو اشک آور گیس کے بعد گولی چلانی پڑی اور گورنر قبرص کو ریڈیو پر جا کر ''لونڈوں'' کے والدین کو ''انتباہ'' کرنا پڑا۔

یونانی چاہتے ہیں کہ قبرص یونان کو ملنا چاہیے لیکن برطانیہ اسے ''بتدریج'' حق خوداختیاری اور ''آزادی'' دینا چاہتا ہے۔

یونانی لونڈوں نے ان مظاہروں میں برطانوی سرکاری دفاتر کے ساتھ ساتھ امریکی دفتر اطلاعات پر بھی ہلہ بول دیا تھا اور امریکہ ''مردہ آباد'' کے نعرے لگائے تھے۔

یونان کے بادشاہ کنگ پال نے ان لونڈوں سے کہا ہے کہ برطانیہ ہمارا ''دوست'' ہے۔ پچھلی جنگ میں اور کوریا میں برطانوی اور یونانی فوجوں کا خون ساتھ ساتھ گرا ہے اور امریکہ نہ صرف ہمارا ''دوست'' ہے بلکہ قبرص اور خود یونان کی بقا کا بھی ذمہ دار ہے۔ ان سے ناراضگی کیسی؟ وقت گزرنے پر ''دوست'' خود ہی راہ راست پر آ جائیں گے۔

ریلوے مزدوروں کی ہڑتال

اگر برٹش ٹرانسپورٹ کمیشن نے برطانیہ کی ''نیشنل یونین آف ریلوے مین'' ....

اس یونین کے چار لاکھ ممبر ہیں جن میں زیادہ تر پورٹر، کیرج سروس مین اور پرمانٹ وے سٹاف اور مزدور ہیں۔ اگر ان کی تنخواہ میں پندرہ فیصد اضافہ کے مطالبہ نو جنوری تک منظور نہ کیا گیا تو برطانیہ بھر میں ریلیں کھڑی ہو جائیں گی۔ اگر کسی نے بیچ بچاؤ نہ کرایا تو ہڑتال کی صورت میں یونین ہر شادی شدہ یا کنوارے رکن کو 36 شلنگ فی ہفتہ ''سٹرائیک پے'' کی صورت میں ادا کرے گی۔

سٹرائیک کی ایگزیکٹو نے یہ فیصلہ برطانوی وزیر مواصلات کے اس جواب پر کیا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں یونین کی مدد کرنے سے معذور ہیں۔

تنخواہوں میں پندرہ فیصد اضافہ کا مطالبہ یونین نے دسمبر 1953ء میں پیش کیا تھا۔ اور 5 دسمبر کو فوری ہڑتال کی دھمکی پر انہیں چار شلنگ فی ہفتہ زیادہ ملنے شروع ہو گئے۔ بعد میں ٹرانسپورٹ کمیشن نے ان کی تنخواہ میں چھ فیصد اضافہ کرنا منظور کر لیا۔ جس پر یونین کی ایگزیکٹو بھی راضی ہو گئیں۔ لیکن ممبروں نے بغاوت کر دی اور پورے پندرہ فیصد اضافہ پر اصرار کیا۔ ان مزدوروں کو سات پونڈ فی ہفتہ سے بھی کم تنخواہ ملتی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ حکومت ان سے سوتیلی ماں کا سا سلوک کر رہی ہے۔



دسمبر 1954

☆......فارموسا اور برطانیہ

☆......''مائٹی'' کا تار

☆......کالوں کی بھرمار

☆......عورت کو پھانسی

(نمائندہ خصوصی مقیم لندن مسٹر مجید نظامی کے قلم سے)

فارموسا اور برطانیہ

اقوام متحدہ میں برطانوی وفد کے سربراہ اور وزیر مملکت برائے امور خارجہ مسٹر انتھنی نٹنگ نے پچھلے ہفتے نیویارک میں اپنے ٹیلی ویژن انٹرویو میں یہ کہہ کر کہ اگر ضروری سمجھا گیا تو برطانیہ چیانگ کائی شیک اور اس کی پناہ گاہ فارموسا کو چینی کمیونسٹوں سے بچانے کے لئے جنگ میں کود پڑنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ برطانوی وزیر خارجہ مسٹر ایڈن کو مصیبت میں ڈال دیا

ہے جو کافی عرصے سے امریکہ اور کمیونسٹ چین دونوں کو خوش رکھنے کی تگ ودو میں تھے۔ مسٹر ننگ کے بیان سے چند ہی دن پہلے ایک برطانوی تجارتی وفد پیکنگ سے تیس لاکھ پونڈ کی مالیت کے آرڈر لے کر لوٹا تھا۔ اس وجہ سے یہاں کے تجارتی حلقے بھی اپنے چونتیس سالہ ڈپلومیٹ کے انٹرویو کو کافی اہمیت دی ہے۔ لیکن اپنی پریشانی کو یہ کہہ کر چھپانے کی کوشش کی ہے کہ جیسا کہ مسٹر ننگ نے کہا ہے اگر فارموسا پر حملہ ہوا تو یو این او ضرور کوئی قدم اٹھائے گی کیونکہ نواب فارموسا جناب چیانگ کائی شیک کا ''قوم پرست چین'' ہی ابھی تک اقوام متحدہ میں چین کا ''اصلی نمائندہ'' ہے۔ اور چونکہ برطانیہ بھی اقوام متحدہ کا رکن ہے۔ اس لئے اسے بھی اقوام متحدہ کے اقدام میں شریک ہونا پڑے گا۔ بہرحال برطانیہ کی پوزیشن نہایت دلچسپ ہے۔ وہ پیکنگ کی کمیونسٹ حکومت کو چین کی نمائندہ حکومت تسلیم کر چکا ہے اور چین سے تجارتی تعلقات زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہتا ہے لیکن امریکی پالیسی کی وجہ سے مجبور ہے کہ اقوام متحدہ میں ''قوم پرست چین'' کو ہی چینی عوام کا نمائندہ تسلیم کرے...... ادھر مسٹر ننگ نے کینیڈین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو انٹرویو دینے کا پروگرام منسوخ کر دیا ہے۔ آپ کے ترجمان کا کہنا ہے کہ آپ کی ''زبان بندی'' نہیں ہوئی اس کا باعث آپ کی دیگر مصروفیتیں ہیں۔

''مانٹی کا تار''

فیلڈ مارشل جنرل منٹگمری کے نام مسٹر چرچل کے تار کا جھگڑا ابھی تک جاری ہے۔ ہاؤس آف کامنز میں لیبر پارٹی کے چند ارکان کو جب موقع ملتا ہے وہ اس تار کے بارے میں پوچھ لیتے ہیں اور وزیر اعظم سے استفسار کرتے ہیں کہ آیا وہ جنرل پر ایک اہم سرکاری دستاویز اپنے قبضے میں رکھنے کے الزام میں مقدمہ چلا رہے ہیں یا نہیں؟ یوں لگتا ہے مسٹر چرچل اب اس نوک جھونک سے تنگ آ گئے ہیں، انہوں نے پارلیمنٹ میں اس تحریک کے لیڈر مسٹر وگ سے کہا ہے کہ اب جنرل منٹگمری کے خلاف یہ ''شرارت آمیز'' پراپیگنڈا بند ہونا چاہئے۔ کیونکہ برطانوی عوام کی اکثریت اس سے ''کمینگی'' کے مترادف سمجھتی ہے۔

کالوں کی بھرمار

لندن کی عام گوری آبادی کالوں سے خاصی پریشان ہے۔ کالوں سے مراد ہندوستانی' پاکستانی نہیں۔ پنجاب اور صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والوں کو یہاں کوئی شاذو نادر ہی کالا سمجھتا ہے لندن والے بالعموم انہیں' سپین یا اٹلی کا رہنے والا سمجھتے ہیں۔ میں کل اپنے ایک بہاری۔۔۔ثم لاہوری دوست کے ساتھ کمرہ کی تلاش کر رہا تھا کہ ایک لینڈ لیڈی نے پوچھا آسٹریلیا سے آئے ہو؟۔ یہ کالے اصلی ''کالے'' ہیں ان میں افریقہ کے حبشی امریکہ کے نیگرو بالخصوص جمیکا کے اصلی باشندوں کی خالص اولاد شامل ہے۔ان میں سے اکثر بندرگاہوں طول اور کالوں میں کام کرتے ہیں، سینکڑوں نوجوان یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر بندگاہوں ملوں اور کالونی میں کام کرتے ہیں سینکڑوں نوجوان یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں جب یہ آوارہ اور اوباش سفید فام لڑکیوں کو اپنے ساتھ چمٹائے فٹ پاتھوں پر پھرتے ہیں یا ہوٹلوں بسوں اور ریل گاڑیوں میں داخل ہوتے ہیں تو نیم جاہل گوروں کا خون کھول جاتا ہے۔اکثر بڑی بوڑھیاں وہاں سے اٹھ کر چلی جاتی ہیں کئی لینڈ لیڈیز انہیں اپنے ہاں کمرہ دینے سے انکار کر دیتی ہیں۔لیکن برطانیہ نے قانوناً ان کے داخلے پر پابندی عائد کرنا ضروری نہیں سمجھا اور حکومت نے ''عوام'' کی طرف سے بڑھتے ہوئے احتجاج کی طرف کوئی توجہ دینا مناسب نہیں سمجھا۔البتہ آج کل چرچل وزارت اس مسئلہ پر غور وخوض کر رہی ہے۔امید ہے کہ حکومت ہوم سیکرٹری کو ان ''کالوں'' کو ملک بدر کرنے کے اختیارات دے دے گی۔ جو کسی شدید نوعیت کے الزام میں سزا یافتہ ہوں گے۔ حکومت ہوم سیکرٹری کو ایسے اختیارات بھی سونپ دے گی جن سے وہ یہ دیکھ سکیں کہ آیا آنے والے ''کالے'' کو روزگار ملنے کے امکانات ہیں یا نہیں اور وہ کچھ عرصہ اپنی جیب سے بھی خرچ کر سکتا ہے، یا نہیں...... بہرحال اسی قانون میں رنگ یا نسل کا ذکر نہیں ہوگا...... یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس سلسلے میں ٹوری اور سوشلسٹ دونوں متفق ہیں۔

سرکاری اندازے کے مطابق برطانیہ میں اس وقت نوآبادیوں کے پچاس ہزار

''کالے'' آباد ہیں۔ جنگ کے بعد صرف ویسٹ انڈیز سے ہی اوسطاً دو ہزار ''کالے'' ہر سال برطانیہ آ رہے ہیں اور اس سال تو ''کالوں'' کا سیلاب آ گیا ہے۔ ان کی تعداد آٹھ ہزار پانچ سو ہے...... امید ہے اگلے دو ہفتوں یعنی اس سال کے خاتمے سے پیشتر ۵۰۰ ''کالے'' اور آئیں گے۔

عورت کو پھانسی

کل لندن کی ایک جیل میں ۵۸ سالہ مسز کرسٹوفی جسے اپنی ۴۵ سالہ بہو کے قتل کے الزام میں پھانسی چڑھایا گیا ہے، ۱۹۵۵ء کے بعد برطانیہ کی تیرہویں اور ۱۹۲۳ء کے بعد لندن کی پہلی خاتون ہے جسے پھانسی کی سزا ہوئی ہے۔





جناب مجید نظامی
اپنی رفیقہ حیات
محترمہ ریحانہ اور
بیٹی رمیزہ کے ساتھ



جناب مجید نظامی کا عالم شباب





صدر ایوب خان کی پریس کانفرنس میں مجید نظامی دیگر مدیران جرائد کے ساتھ شریک ہیں

65ء کی جنگ [illegible]

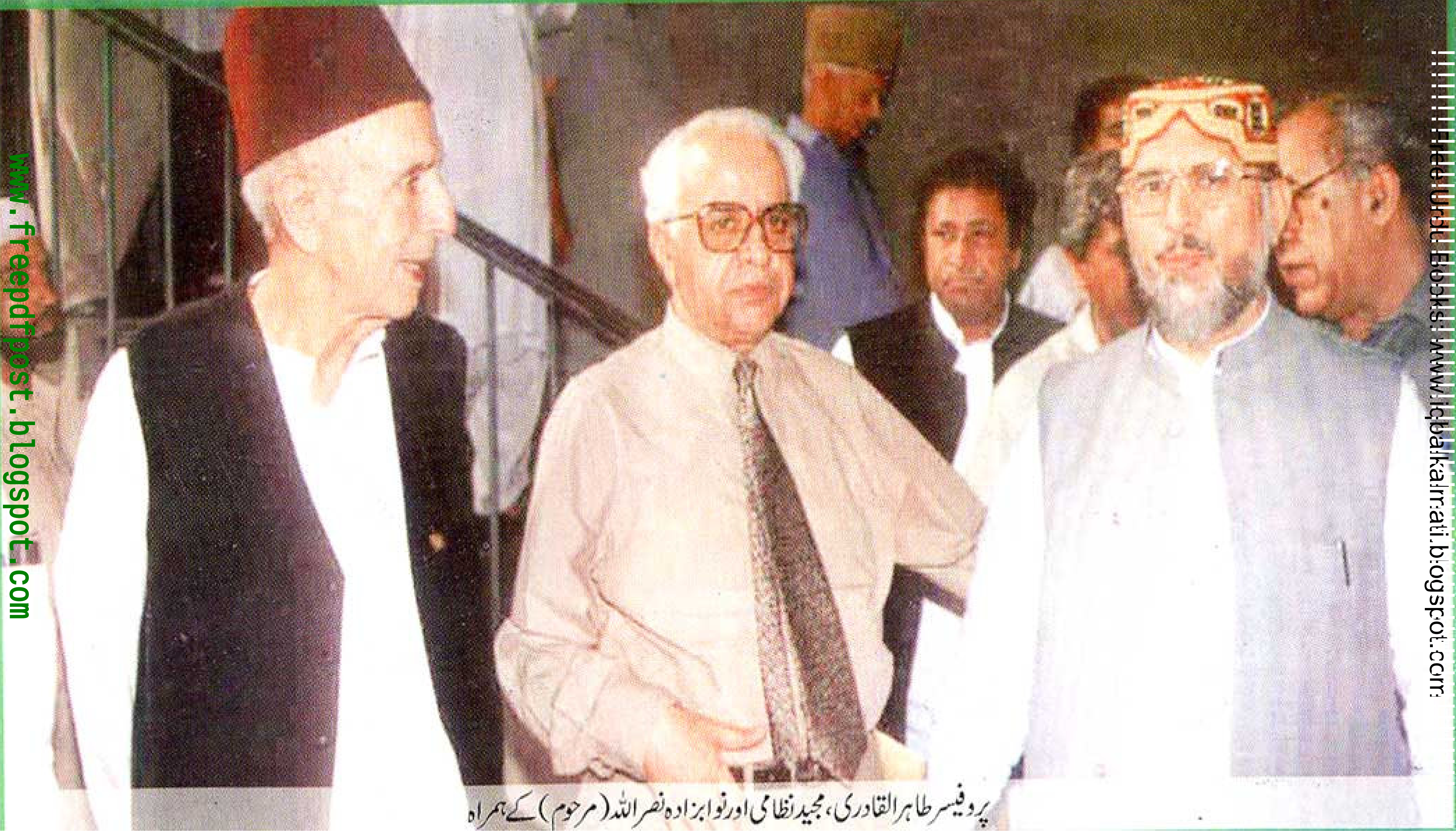


65ء کی جنگ کے دوران بی آر بی نہر پر مجید نظامی، شورش کاشمیری فوجی جوانوں کے ہمراہ



یوم حمید نظامی وائی ایم سی اے کے باہر جناب ذوالفقار علی بھٹو (معزول وزیر خارجہ ایوب خان) کی آمد پر جلسہ گاہ کا منظر





پروفیسر طاہر القادری، مجید نظامی اور نوابزادہ نصر اللہ (مرحوم) کے ہمراہ



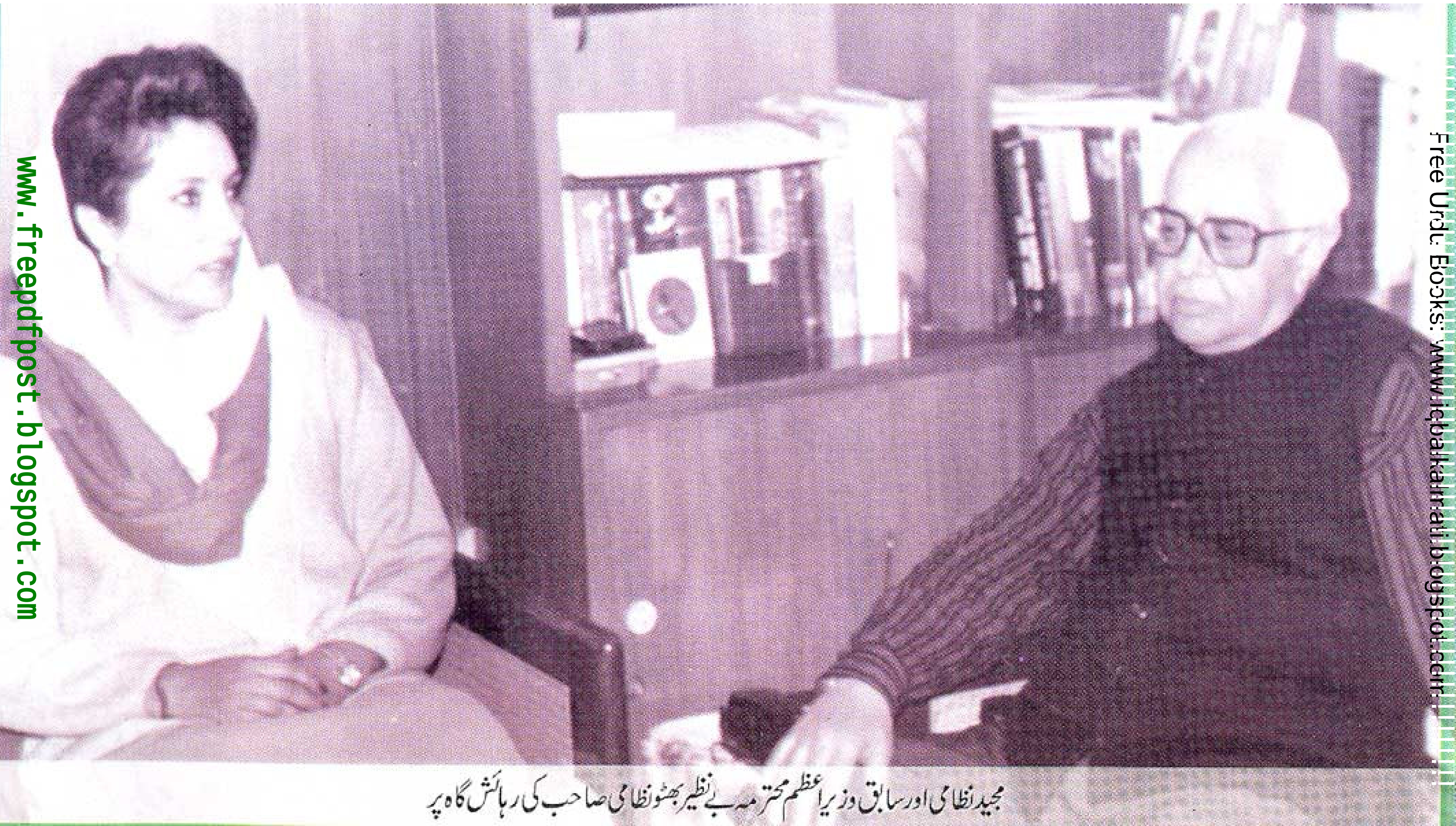
مجید نظامی کشمیری لیڈر عبدالغنی لون اور دیگر کے ہمراہ



سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو اور مجید نظامی یوم اقبال کے موقع پر تقریب میں



پریشان خٹک، صابر شاہ، مجید نظامی، میاں نواز شریف، ڈاکٹر جاوید اقبال، غوث علی شاہ اور جاوید ہاشمی



مجید نظامی اور سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نظامی صاحب کی رہائش گاہ پر



مجید نظامی اور صدر پرویز مشرف کی ایک ملاقات



جسٹس ریٹائرڈ آفتاب فرخ جناب مجید نظامی کو شیلڈ پیش کرتے ہوئے



جناب مجید نظامی صاحب اور ملک کی مشہور ادیبہ وشاعرہ محترمہ عائشہ مسعود، نظامی صاحب کے آفس میں





محترم مجید نظامی اور جناب عارف نظامی

بھٹو کے بارے میں مجید نظامی کی بڑی ''دلچسپ یادیں'' ہیں ...... جب ایوب خان کے دور میں بھٹو کے خلاف پہلا مقدمہ چلا تو مجید نظامی باقاعدگی سے کارروائی سننے لاہور بورسٹل جیل جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجید نظامی نے بھٹو سے شکایت کی کہ یہ آپ ''سوشلزم'' کا کیا شوشہ چھوڑ رہے ہیں یہ تو ہمیں ''مکے'' کی بجائے ''ماسکو'' لے جا سکتا ہے...... کیونکہ سوشلزم لانے کے لئے آپ کو اتنا لیفٹسٹ ہونا پڑے گا یا مشرقی یورپ کے بلاک سے ''فلرٹ'' کرنا پڑے گا کہ اور آپ کو پاکستان کا قبلہ ہی تبدیل کرنا پڑے گا۔۔ جواباً بھٹو کہنے لگے...... یہ سب کچھ فلانے ڈھینگے جے اے رحیم نے کیا ہے...... مجھے باہر آ لینے دو...... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن مجید نظامی کہتے ہیں کہ باہر آ کر انہوں نے جے اے رحیم یا سوشلزم کو کیا ٹھیک کرنا تھا بلکہ ''ہمیں'' ہی ٹھیک کرنا شروع کر دیا......